کاٹھ کی عورتیں

(افسانے)

ڈاکٹر سلیم اختر

www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ

کاٹھ کی عورتیں

(افسانے)

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Saleem Akhtar, Dr.
Kaath Ki A'aurat/ Dr. Saleem Akhtar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2012.
231pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بھی صورتحال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

2012

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2529-9
ISBN-13: 978-969-35-2529-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore-54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 , 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انیس ناگی

کے نام

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

ترتیب

پھن پُھول	7
سویٹ ہارٹ	29
کانا چور	50
موری کی اینٹ	67
کاٹھ کی عورتیں	88
گندہ خون	98
کھونٹا	107
جلے پاؤں کی بلی	114
ربیسرے دی جورو	129
بیوی کا الاؤ	139
بیویوں کی سازش	148

مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس	159
آخری سبق	169
کاسانوا: 1972ء	177
بچھو	192
بکری	199
نقلی چوکیدار	204
جن ہتھیلیوں پر سرسوں پھولتی ہے	212
مثلث کا ایک زاویہ	220
بیلنس شیٹ	227

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پھن پُھول

تب دیوتا انگڑائی لے کر بیدار ہوا' اس نے تیسری آنکھ کھولی جو کرن بن کر سنسار کو اجالے سے دھو گئی۔ اونچے بہت اونچے پربت کی چوٹی نے برف کا گھونگھٹ سرکایا تو دھوپ نے چہرہ پر گلال مل دیا۔ دھوپ کے روشن اور رقصاں ذرّات دھرتی کی اس اُور سے اُس اور تک پھیل گئے یوں کہ پاتال بھی روشنی سے بھر گیا' لہروں نے جھاگ کا آنچل اوڑھا تو اُس میں روشنی کے ساتھ رنگوں کے تال میل سے نیا رنگ چمک رہا تھا۔ گگن نے نیلی جھیل کا رنگ چرایا اور اترایا کہ یہ رنگ سندرتا میں انوکھا اور مدھرتا میں نرالا تھا۔ جب اندر دھنش نے رنگوں کا میلہ لگایا تو گگن مور بن کر ناچا کہ دھرتی کے پاس اس چتر کاری کا جواب نہ تھا۔ اس سمے کہ دھرتی رنگوں اور روشنی کا اشنان کر رہی تھی تو دیوتا کی انگڑائی دھرتی سے گگن تک پھیلی یوں کہ سورج اور چاند اس کے پھیلاؤ میں گم ہوئے اور ستارے کھو گئے' دیوتا نے سب کو دیکھا' ٹٹولا اور خوش ہوا۔

اس سمے کہ دھرتی آکاش اور سورج سب اپنی تکمیل کی مدھ میں ڈوبے خوشی کی ترنگ میں تھے تو دیوتا کو اپنی خوشی کا بلبلہ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ کہیں نہ کہیں کچھ کمی رہ گئی تھی ضرور کوئی چوک ہوئی ہے یقیناً کوئی بھول ہوئی ہے۔ اس نے ڈمرو بجایا اور تانڈو ناچ میں مصروف ہو گیا۔ آکاش اور چندرماں سے لے کر دھرتی اور پاتال تک کی مخلوق ناچ میں شریک تھی مگر آج تانڈو ناچ کی مدھرتا رس سے خالی تھی۔ اس نے بے چینی سے سیاہ گھٹاؤں جیسی جٹائیں جھٹکیں تو دل کے چھالے کی مانند گنگا پھوٹ بہی' دھرتی نہال ہو گئی دنیا شانت

PAKISTANIPOINT

ہوئی مگر دیوتا اشانت ہی رہا۔۔۔۔۔کہاں چوک ہوگئی؟ کہاں بھولا؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اگر بھولا تو کیوں؟ یہ چوک کیسے ہوگئی؟ دیوتا سے غلطی؟ اگر دیوتا غلطی کرنے لگے تو دنیا کا کیا بنے گا۔ مانس کیا کرے گا؟

دیوتا نے بے کل ہو کر سوم رس کے کئی پیالے پیے مگر آج تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سوم رس کی جگہ گرم پانی پی لیا ہو بدمزہ اور باؤلا پانی' اسی لیے سوم رس پینے کے باوجود ہردہ کا کنول نہ کھلا' من مور نہ ناچا اور سُست شریر میں تانڈو ناچ کے لیے جیسے جان ہی نہ ہو۔

اس نے اپنی آتما کے نصف حصہ کو من پسند روپ دیا اس کے ساتھ بھوگ کیا مگر شریر شانتی کے ساگر پر جل پنچھی بن کر نہ اڑا بلکہ اشانتی کے گہرے پانیوں میں پتھر کی طرح گرتا چلا گیا۔ تو اب کیا کرے؟ متھن کے بعد کرنے کو کیا رہ گیا۔

وہ اس چنتا اور دبدھا میں بیاکل تھا کہ اچانک پسلی پھڑکی۔۔۔۔۔ ہیں! یہ کیا پسلی پھڑکی! اس کی تو کبھی آنکھ نہ پھڑکی تھی تو یہ پسلی کیسے پھڑک اُٹھی اور کیوں؟ سب سے بڑا سوال اس کیوں کا تھا! یہ آج کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ اس کی شکتی چھینی جا رہی ہے یہ سوچ کر وہ اور نراش ہو گیا۔ اگر واقعی شکتی چھین لی گئی اور اسے محض پُرش بنا دیا گیا تو وہ کیسے زندہ رہ سکے گا ضرورت پڑنے پر دیوتا امانش تو بن سکتا ہے مگر مانش نہیں!

وہ اسی چنتا میں تھا کہ پسلی پھر زور سے پھڑکی یوں کہ باہر آ گری' ہائیں یہ کیا؟ یہ پسلی کیسے ٹوٹ گئی؟ تو کیا کوئی اس سے بھی بڑا دیوتا اب اس پر چھا گیا ہے جو یوں انگ انگ ادھیڑ رہا ہے!۔۔۔۔۔مگر نہیں یہ پسلی نہیں تھی بلکہ ایک نئی جاندار چیز تھی۔ گو وہ پسلی جیسی ہی ٹیڑھی تھی مگر پسلی نہ تھی' اس نے جھک کر اسے دیکھا کھال پر اندر دھنش کے رنگ' گول نینوں میں متوالی سرخی اور دو شاخہ زبان۔ دیوتا نے ایسا وجود نہ دیکھا تھا۔ وہ حیرت زدہ دیکھتا رہا' کیا یہ اس کی آتما کا شریر ہے؟ مگر اس سوال سے بھی بڑا سوال اسے پریشان کر رہا تھا وہ اس کا پتا پا یا ماں۔ کس بھوگ کے کارن اس نے جنم لیا' یہ کس متھن کا پھل ہے!

آج دیوتا کی پریشانی کا دن تھا۔ ایسے کٹھن سوالات کہ درست جواب کی

تلاش میں یگ بیت جائیں' یقیناً کچھ ہونے والا تھا جو اسے ایسے سوالوں کے جنجال میں ڈالا گیا ہے۔

تب اس نے اپنی تیسری آنکھ سے اُسے دیکھا مگر پھر بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔ یہ من موہن سندرتا اس جگہ کی تو نہ تھی' کیا یہ اندر کے اکھاڑے سے بھاگی ہوئی اپسرا ہے؟ مگر نہیں' یہ کسی اور یگ کی باسی تھی جو غلطی سے اس جگ میں آ گئی مگر یہ تو اس کی پسلی سے نکلی ہے' اگر میں نے ہی اسے جنم دیا تو کیسے؟ پتا پایا ماتا' مگر ایک بات تھی کہ اس من موہنی صورت کو دیکھ کر اس کی اشانتی اور رُوبدیا ہا ختم ہو گیا تھا' شریر جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا اور من مور ناچنے کو تیار' وہ گول اور سرخی کی مدھرتا میں ڈوبی آنکھیں اس کی آنکھوں سے گویا مقفن کر رہی تھیں اس کا ہر دہ ہنڈولے لے رہا تھا۔ فضا کی خاموشیوں میں ایسے ساز کی آواز گونجی جسے آج تک کسی نے نہ سنا تھا۔ عجب تال تھی اور عجب گت' یہ آواز شریر کو ساگر بنا کر اس میں عجب جوالا بھڑکا رہی تھی گویا شریر کا ساگر متھا جا رہا ہو۔

اس نے ڈمرو اُٹھا کر تانڈو ناچ شروع کیا تو سنگت کو دھرتی گگن اور چندر ما بھی تھے مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ نین کٹوروں میں مدھر رس لیے وہ بھی ناچ کی ساتھی تھی۔ وہ اپنے پورے قد سے کھڑی تھی' جو پسلی نظر آتی تھی اب دیوی سمان تھی۔ وہ کیا تھی اندر دھنش تھی' رنگوں کا میلہ تھی' رس کا جوار بھاٹا تھی' سوم رس کی گاگر تھی' مدھرتا کا ساگر تھی اور شانتی کی گھنگھور گھٹا تھی۔ دونوں کے نین ایک دوسرے کا درپن تھے۔ دیوتا کی بڑی بڑی آنکھوں میں روشنی کی گھٹا اتر آئی تھی جبکہ اس کی گول آنکھوں کی سرخی میں ڈوبتے سورج کا سونا گھل گیا تھا' نینوں کی امربانی میں نینوں کا امر رس بھی تھا۔ تب دیوتا نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں سے عجب جادوئی لہریں خارج ہو رہی ہیں ایسی لہریں جو اس کی آتما اور شریر کے گرد جال بنتی جا رہی تھیں اب آنکھیں خون بھرے کٹورے تھیں اُن میں مقناطیسی لہروں کا جوار بھاٹا تھا' ان میں بھنور تھے بھنور میں بھنور' بھنور میں بھنور' بھنور میں بھنور' وہ ان میں ڈوبا جا رہا تھا' ڈوبتا جا رہا تھا' مگر یہ ڈوبنا اچھا لگ رہا تھا۔ کیا آنند تھا اچانک اسے احساس ہوا کہ اب وہ اسے نہیں نچا رہا بلکہ وہ اسے نچا رہی ہے۔ ڈمرو اس کے ہاتھ میں تھا مگر گت اس کی نہ تھی' مقناطیسی لہروں کا جال تنگ ہوتا جا رہا تھا بلکہ اب تو وہ خود بھی اس جال کو دیکھ رہا تھا جس میں

شریر اور آتما دو مچھلیوں کی مانند پھنسی نظر آئیں پہلے دونوں کے منہ مخالف سمت میں تھے مگر پھر وہ آہستہ آہستہ جیسے کسی غیر مرئی دائرہ میں گھومنے لگیں، تب ان کی قوس مل کر ایک ہو گئی اور انہوں نے دائرہ کی صورت اختیار کر لی..... منڈل!

تانڈو ناچ اب منڈل کے ناچ میں تبدیل ہو چکا تھا۔

دونوں ناچا کیے، ندی تھک گئی، دھرتی تھک گئی، گگن تھک گیا، سورج چاند اور ستارے تھک گئے مگر وہ نہ تھکے۔ ڈمرو بجتا رہا آتما کی جوالا نے شریر کو جوالا مکھی بنا دیا، تن من شعلوں میں تبدیل ہو گئے۔ اب وہ تیار تھا متھن کے لیے، اس متھن کا پھل آکاش بیچ ایک ہوگا۔ اس نے رک کر اسے بانہوں میں لیا اور عین مدھرتا کے سندر پل میں دوشاخہ زبان بجلی بن کر دیوتا پر گری..... یہ عجیب ٹیس اور نرالی پیڑا تھی۔ آج تک دیوتا پیڑا کے ڈنگ اور اس کی مستی سے ناواقف تھا اس لیے اس ٹیس میں سوم رس کی ہزاروں گاگروں کا مزا تھا۔ وہ گر گیا، دیوتا گر گیا، پپوٹے بھاری ہو کر دونوں آنکھوں پر گرتے جا رہے تھے۔ ٹیس کے جوار بھاٹا پر شریر بن تیوار کی نیا بنا تھا۔ اس نے پوری آتما شکتی سے کام لے کر بند ہوتی تیسری آنکھ کو کھولنا چاہا مگر پھر سوچا کیا فائدہ۔ پیڑا کی مٹھاس انجانی سہی مگر آتما راس تھی۔ جب تیسری آنکھ پر کبھی نہ اُٹھنے کو پپوٹے گرے تو دیوتا کی سوچ یہ تھی۔ یہ اگر موت ہے تو بُری نہیں کہ اس کا آنند نرالا ہے۔

(2)

اس نے گردن اٹھا کر دیکھا، منظر چاندنی کی دودھیا چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ درخت خاموش، پکھیرو خاموش، رات خاموش اور ہوا خاموش، صرف جھرنے کی ترل جاری تھی۔ اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا، گول آنکھوں میں طلب کے سرخ ڈورے شام کی گہری ہوتی شفق کا رنگ لیے تھے۔ اگرچہ جسم پر اندر دھنش کے رنگوں کی لیلا تھی مگر آنکھوں کی سرخی سب سے بڑھ کر تھی کہ من موہنی تھی۔ دوشاخہ زبان لہرائی، وہ اب پورے قد پر کھڑی تھی اُس خاموش منظر کی رانی اور رانی بن کر ہی اس نے ارد گرد دیکھا مگر سامنے کچھ بھی نہ تھا۔ منظر پر خاموش رات کا پہرہ تھا اور یوں لگتا گویا چاند کے دودھ کی گاگر اب الٹنے کو ہے۔ اس سے کرن کا آخری قطرہ بھی گر جائے گا اور منظر پرچھائیوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔

دوشاخہ زبان لہرائی تو جی میں آئی کہ اس سے اپنے وجود کو پیار کرے‘ سہلائے‘ یوں کہ زبان کا نشہ انگ انگ میں اتر جائے یوں کہ متھن کی رس بھری پھوار سے نیا جنم پائے۔

وہ پھر پورے قد سے کھڑی تھی۔ نین بے چین‘ جیا بیاکل‘ آتما اشانت اور زبان میں انجانے ذائقوں کے لیے تڑپ!

تب اسے اپنے سامنے رنگوں کا پنکھا کھلتا نظر آیا اودے رنگوں کی گھٹاؤں میں سنہری آنکھوں کا جال تھا۔ لمبی خم دار گردن جو اس کے اپنے وجود سے مشابہت رکھتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں مستی کی جو گھٹا ناچ رہی تھی اس نے رنگ بدل کر سر پر تاج کی صورت اختیار کر لی تھی‘ سندر تن‘ من موہنا روپ اور چال میں مدھرتا۔ وہ سب سے بے پروا اپنے رنگوں کے درپن میں اپنا نظارہ کر رہا تھا۔ جھوم رہا تھا۔

دونوں ٹھٹھکے‘ ایک دوسرے کو دیکھا‘ آنکھ آنکھ کا درپن بنی‘ انگ نے انگ کی پکار سنی‘ انگ انگ کو سمجھ رہا تھا۔ وہ پورے قد سے کھڑی تھی وہ پگ پگ بڑھ رہا تھا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔ گول آنکھوں کی سرخی اس کے خون میں عجب جوار بھاٹا پیدا کر رہی تھی وہ اس سے خوف زدہ بھی تھا‘ مگر خود کو اس سے دور بھی نہ رکھ سکتا تھا‘ یہ کون ہے؟

یہ وہ تو نہیں؟ وہ سوچ رہی تھی۔

وہ اب بھی پورے قد سے کھڑی تھی‘ وہ ٹھٹکتا جھجکتا اس کی اور بڑھا آ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا‘ وہ اسی کو تک رہی تھی‘ یہ دیکھنا کیا تھا ان آنکھوں میں کیا تھا‘ کس ساگر کی لہریں اُن میں سما گئی تھیں کہ وہ ان میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کے وجود میں عجب سنسناہٹ تھی‘ رگوں میں عجب سرسراہٹ تھی۔ پاؤں جیسے انگاروں پر ہوں اور پھر اس اگنی نے پاؤں جلانے شروع کیے۔ کبھی ایک پاؤں اٹھتا کبھی دوسرا اور پھر جیسے اس اگنی کے شعلے سرگم میں تبدیل ہو گئے اب اس کے پاؤں سرگم کے سروں پر اُٹھ رہے تھے‘ وجود کی بیاکلی پاؤں میں گھنگرو بن کر چھنکنے لگی تھی۔ ہردے کی پیڑا نے خون کی جوالا بھڑکا دی تھی‘ وہ پہلی مرتبہ مستی کی گھٹا میں یوں اڑا کہ اپنے وجود سے بھی آگے نکل گیا۔

وہ اپنے پورے قد سے کھڑی تھی‘ وہ اس کے اردگرد ناچ رہا تھا۔ رنگوں کا پنکھا

اسے مستی کی ہوا دے رہا تھا۔ایسی ہوا جو اس کے تن میں انوکھا جوار بھاٹا پیدا کر رہی تھی۔ اس کا تن ڈولنے لگا انگ انگ ہلکورے لینے لگا اور شریر گھومنے لگا۔دونوں آمنے سامنے تھے درپن کے سامنے درپن وہ اس کی گردن سے لپٹ گئی اور اب وہ دونوں ناچ رہے تھے۔ دونوں ایک ہی اگنی کے شعلوں کے سُر میں تبدیل ہو گئے۔ وہ یوں مست ہو کر ناچا کہ خاموش رات کی سانسوں کے سر جاگے۔ نیند میں ڈوبی کرن کلیاں پھول بن کر مہکیں اور رات کے بوجھل پل میں بجھتے دیپ جیسے ستارے لودے اٹھے۔

وہ دونوں اپنی اپنی مستی کی آگ میں جلتے ناچے جا رہے تھے۔ان کے وجود کے انگارے دھک دھک شعلے بنے' شعلوں کی زبان نے ان کے انگ انگ کو پیار سے سہلایا۔ رنگوں کا پنکھا شعلوں کے پنکھے میں تبدیل ہو گیا۔ ادھر اس نے شعلے کی زبان یوں منہ میں لے لی کہ دوشاخہ زبان اور شعلے کی زبان ایک ہو گئیں۔

وہ اس کی گردن سے لپٹی تھی جسم کا باقی حصہ رنگوں کے پنکھے کی لہروں پر ڈول رہا تھا جسم کا دائرہ بنتا' ٹوٹتا اور پھر جڑتا۔ آنکھوں میں رات اتر آئی تھی' جسم میں سمندر نے بسیرا لے لیا تھا اور ہر دہ اگن کنڈ بن گیا تھا۔ وہ دونوں لپٹے ایک ہو گئے اور تب عین اس لمحہ کہ متھن سے منڈل کے دائرہ نے مکمل ہونا تھا اس نے اس کی گردن چھوڑے بغیر پاؤں کو یوں جکڑ لیا کہ وہ ساکت ہو گیا۔تب دوشاخہ زبان بجلی بن کر اس کے تاج اس کی آنکھوں اس کے منہ اور اس کی گردن پر گری یوں کہ زندہ رنگوں کا پنکھا صرف چتر بن کر رہ گیا۔

اس نے گردن اٹھا کر رنگوں کی بے جان مورت کو دیکھا جو اب کبھی نہ تھر کے گی' جس کی کوک سُر نہ جگائے گی اور جس کے رنگ جنگل میں پھول نہ کھلائیں گے۔ یہ تو پہلے بھی زندہ نہ تھا کہ صرف اپنی اگنی میں جلتا تھا دوسرے کی اگنی سے بے خبر' یہ اپنی پیڑا کے مزہ کا رسیا تھا' دوسرے کے درد سے بے خبر اور اب یہ محض ایک چتر تھا۔ مردہ رنگوں کا چتر۔

اس کا سفر جاری رہا...... وہ کہاں ہے؟

گردن اٹھا کر دیکھتی جیسے آنکھیں کھوجتی ہوں' جیسے آہٹ لے رہی ہو! مگر کچھ نہیں' صرف پاؤں دبا کر چلتی ہوا' صرف جنگل کی سرگوشی' صرف آبشار کا زور' صرف بارش کا شور' صرف پرندوں کی آواز' صرف بھاگتے جانوروں کی دھمک اور ان سب آوازوں کی

گونج، گونج میں گونج اور یہ سب دل کے خالی مکان میں گونجتے۔

کہاں ہے وہ؟

بے کلی نے جسم کی چنچلتا چھین لی تھی۔ انگ انگ جیسے دکھ رہا ہو۔ آنکھوں کے پیالوں کی مدھرتا پر جیسے کائی چھا گئی ہو، اسے جسم سے شکتی نچڑتی محسوس ہو رہی تھی، من کی جوالا من چاٹ رہی تھی۔ بے چینی دور کرنے کے لیے وہ کانٹوں بھری جھاڑی میں گھس گئی کہ چھلنی ہو کر جسم سکون پائے۔ اس کانٹوں بھری جھاڑی میں کانٹوں سے کھیلتی رہی لڑتی رہی الجھتی رہی اور بالآخر جب باہر نکلی تو نئے رنگ میں تھی، اس کے جسم نے اندردھنش اتار پھینکی تھی اور اب وہ اس رنگ میں تھی، جو پہلے رنگوں سے میل نہ کھاتا تھا کہ یہ رات کے دل کا رنگ تھا!

جب رات کے دل سے تاریکی کا آخری قطرہ بھی نچڑ گیا اور وہ نڈھال ہو کر صبح کی گود میں ڈھے گئی تو طلوع ہوتے سورج کی ٹیڑھی کرن نے کانٹوں کی زبان پر شبنم کے قطرہ کو نیزے کی انی میں تبدیل کر دیا، وہ ٹھٹھک کر رک گئی اور کانٹے کی نوکیلی زبان پر ملتے اور رنگ بدلتے موتی کو دیکھتی رہی۔ اندردھنش کے سبھی رنگ اس میں چمک رہے تھے، یہ رنگوں کا میلہ تھا کہ رنگوں کی لیلا، رنگوں کی یہ وہی جوالا تھی جس نے اس کے تن پر اندردھنش سجائی تھی مگر من کی جوالا کن رنگوں کے کارن سلگتی تھی! اور یوں سلگی کہ تن کے سبھی رنگ اس میں جل کر سیاہ ہو گئے اور پھر ان کی سیاہی اس کے تن کو اپنے رنگ میں رنگ گئی اور وہ دن سے رات بن گئی۔

رنگوں کی رنگ بدلتی جوالا آنکھوں کا منظر بدل رہی تھی۔ دل کا موسم تبدیل کر رہی تھی اور وہ جھوم رہی تھی، جھوم رہی تھی رنگوں کی مستی سے اپنے من کی اگن اور تن کی لگن سے۔ وہ چاروں طرف موسیقی کی لہروں کا رقص محسوس کر رہی تھی۔ ایسی موسیقی جس کے زیر و بم میں شعلوں کی لپک تھی، تن مستی اور من اگنی ایک لے پر ناچ رہی تھی اور وہ بھی اس ناچ میں شریک تھی، وہ اپنے پورے قد سے کھڑی ناچ رہی تھی! ایسا ناچ کہ تن من اور آتما ایک ہو گئے۔ وہ ناچتی رہی، ناچتی رہی اور موسیقی اگنی بنی اس کے وجود میں انگارے سے بھرتی گئی، ناچ کا دائرہ بنتا اور بگڑتا رہا، پھیلتا اور سمٹتا رہا، تن، من، آتما، ناچ، موسیقی، رنگ اور آگ۔ یہ

سب دائرہ در دائرہ تھے مگر مرکز ایک ہی رہا...... بلکہ وہ تو خود ہی مرکز بن چکی تھی!

جب بالآخر اس نے کانٹے کو منہ میں لیا تو پیاس شبنم سے نہیں بلکہ اپنے لہو سے بجھی!

(3)

گدھ اپنے لمبے لمبے پروں سے منزلیں مارتا چلا آ رہا تھا۔ بھوک کی منزلیں، پیاس کی منزلیں...... آرام کی تلاش میں تکان کی منزلیں...... اس کے نیچے صحرا کا سمندر موجیں مار رہا تھا، جھکڑ ریت کے تودوں کو ٹیلوں میں تبدیل کر رہے تھے، ٹیلوں کی ریت رقص کرتی بارش کی طرح برس رہی تھی اور ریت کی اس بارش میں بگولے خوشی سے تھرک رہے تھے، جھوم رہے تھے۔ اپنے دائرہ میں گردش کرتے، رکتے تو ذرات میں تبدیل ہو جاتے اور چلتے تو رقص کے انداز میں!

گدھ یہ سب کچھ دیکھتا جا رہا تھا اس کی تجربہ کار آنکھیں ریت کے سمندر میں بدلتے مناظر کی شناسا تھیں، ریت سمندر کے جزیرے اور ان ریت جزیروں میں ریت جھیلیں وہ ان سے آگاہ اور ان کی اصلیت جانتا تھا اسی لیے وہ کبھی بھی انسان کی مانند سراب کے آسیب کا اسیر نہ ہوا تھا اور غالباً اسی لیے انسان کی مانند وہ کبھی بھی ریت سمندر میں ڈوب کر نہیں مرا تھا...... لیکن اب اس نے جو دیکھا وہ نظر کا دھوکا نہ تھی واقعی نیچے بستی کے آثار تھے جیسے سیاہ بادل اچانک پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے ایک ستارہ چمک اُٹھتا ہے اسی طرح ریت کے خشک سمندر میں ستارہ سا پانی چمک رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ کی سبز رنگت گدھ کی آنکھوں میں تراوٹ کا سرمہ لگا گئی۔ ذرا نیچے آیا تو اسے متحرک سایوں کی صورت میں انسان بھی نظر آ گئے اور گھر بھی جن سے دھوئیں کی انگلیاں گویا اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

وہ اترنے کو تھا کہ بستی سے باہر مردہ گائے پر نگاہ پڑی، جس کی اکڑی ٹانگیں فضا میں معلق تھیں، گردن ایک طرف کو ٹیڑھی تھی، کھلی آنکھوں کا پانی ایک لکیر بناتا بہہ چکا تھا، پیٹ پھولا تھا اور نتھنوں کے راستہ مکھیاں آ جا رہی تھیں۔

سڑے ہوئے گوشت سے بدبو کے اٹھتے بھبھکے اس کی تھکن دور کر رہے تھے اور اعصاب کو تقویت دے رہے تھے۔ وہ اپنے پر پھیلائے قدم قدم اس کے گرد پھر رہا تھا۔

کہیں کہیں سے گل کر کھال پھٹ گئی تھی اور اس میں سے گوشت باہر نکل آیا تھا۔ گائے کی اکڑی ٹانگوں میں اس کے تھن پھولے پھولے تھے اور ان پر خون جما تھا یہاں بھی مکھیوں کی بھیڑ تھی۔ گائے کے چاروں طرف سنہری چیونٹیوں اور سرخ اور سیاہ چیونٹوں کی فوج تھی جو دیوانہ وار گائے کے سوراخوں میں داخل ہو رہی تھی۔

گدھ کو اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کھاجے کا بلاشرکت غیرے مالک ہے۔ اس نے خوشی خوشی گائے کے اردگرد اچھلتے ہوئے دو تین چکر لگائے۔ پھر آسمان کی جانب دیکھا جہاں اور کوئی گدھ نہ تھا پھر گردن ٹیڑھی کر کے بستی کو دیکھا کوئی کوا اور کتا بھی حصہ بٹانے کو نہ تھا...... یقیناً وہ اس دعوت کا مالک تھا' اس کی آنکھیں لذت کے احساس سے چمک رہی تھیں۔

اور تب اس نے گائے کے نرم سے حصے پر چونچ ماری۔ نرم کھال کو چیر کر چونچ چربی میں اترتی گئی اس کا معدہ خوشی سے گا اٹھا۔ اس نے چونچ بھر کر نوالہ لیا تو تمام جسم میں لذیذ کپکپی کی لہر دوڑ گئی' معدہ کی آگ پر جیسے بارش کے پہلے چھینٹے پڑ گئے ایک نوالہ دوسرا نوالہ تیسرا نوالہ......اور پھر تو نوالوں کی بارش ہو گئی۔ وہ خوشی سے پر پھڑ پھڑاتا جھوم جھوم کر گوشت میں چونچ اتارتا رہا حتیٰ کہ معدہ نے مزید قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا معدہ اب کھایا ہوا باہر نکالنے پر تُلا ہو' معدہ میں گوشت گویا چنگاریوں میں تبدیل ہو گیا ایسی چنگاریاں جو کوئلوں میں تبدیل ہو رہی تھیں اور ایسے کوئلے جنہوں نے جسم کو بھانبڑ بنا دیا۔ اس کی چونچ خود بخود کھل گئی اس کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں ایسی آوازیں جو کسی گدھ نے کبھی نہ نکالی تھیں۔ اس نے پر پھڑ پھڑا کر اڑنا چاہا مگر وہ اب خود کو پرنچا چوزہ محسوس کر رہا تھا...... وہ بھدے ریت پر گرا' کرب سے ایک دو مرتبہ پنجے کھلے اور بند ہوئے اور اس کے بعد اس کے پر ساکت ہو گئے' گردن میں رسی کی طرح بل اور کھلی آنکھوں میں درد کا سمٹا ہوا صحرا!

گدھ کی آنکھ پر اگر بھوک نے پٹی نہ باندھی ہوتی تو وہ یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ گائے کی سفید کھال نیلی ہو رہی تھی' جب وہ یہ نہ دیکھ سکا تو پھر اس نے گائے کے پہلو میں ریت پر ٹیڑھی لکیر کیسے دیکھنی تھی!

چیونٹیوں کی ایک قطار نے اب گدھ کا رُخ کر لیا تھا۔

شام کے ڈھلتے سایوں کے ساتھ ہی دو طویل ہوتے ہوئے انسانی سائے گائے اور گدھ کے مردہ جسموں کے پاس رک گئے چار آنکھیں دلچسپی سے انہیں دیکھ رہی تھیں' ان میں سے ایک بوڑھا تھا سر ڈاڑھی اور بھوؤں کی برف میں اس کا سیاہ رنگ پسینے سے چمک اُٹھا تھا۔ چہرہ پر وقت کی پگڈنڈیوں نے جھریوں کا روپ اختیار کر لیا تھا مگر اس کی چال یا آواز سے بڑھاپے کا اظہار نہ ہوتا تھا' چال میں سو کوس پر دم لینے والی سانڈنی جیسی تیزی اور آواز میں گرج' اس کے ہاتھوں پر اگرچہ نیلی رگوں کا جال تھا مگر ان کی گرفت اب بھی مضبوط تھی۔ اس کا ساتھی نوجوان تھا اس کے چہرہ کا تانبہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں لشکارے مار رہا تھا سر پر سنہری بالوں کا تاج' موٹی آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں بھنورہ جیسی پتلی ایسی سیاہ کہ من بگیا جھوم اُٹھے۔ تراشے ہونٹ رس بھرے تھے' ٹھوڑی کے گڑھے میں سیاہ تل' اس کے سینہ اور اس پر گھنے بال مردانگی کی تصویر تھے مگر اس کے جسم میں عجب لچک تھی' آواز میں عجب نزماہٹ اور انداز میں عجب کوملتا تھی!

''دیکھا داتو۔'' بوڑھے کی انگلی گائے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

''ہاں بابا۔''

''کیا سمجھے؟''

''اسے سانپ نے کاٹا ہے۔''

''ادھر دیکھو۔'' اس نے خون آلود تھنوں کی طرف اشارہ کیا۔

''کچھ سمجھے؟''

''سانپ نے دودھ پیا اور اس دوران اسے کاٹ لیا۔''

''یقیناً۔'' بوڑھا بولا ''عام طور سے سانپ دودھ پیتے وقت کاٹتا نہیں' وہ گائے کی پچھلی دونوں ٹانگوں کو یوں جکڑ لیتا ہے کہ وہ حرکت نہیں کر سکتی اور اس کے بعد وہ اطمینان سے سارا دودھ پی لیتا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ گائے اس کے قابو میں نہیں آئی یا دودھ تھوڑا ہو گا اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے جھنجلا کر اسے ڈس لیا۔''

پھر اس نے گدھ کی طرف اشارہ کیا جس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ ''یقیناً

یہ بڑا زہریلا سانپ ہوگا۔''

''سنگچور؟'' داتو نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے وہی ہو۔ یہ کم بخت ایسا خطرناک ہے کہ ایک مرتبہ اگر پتھر پر زہر تھوک دے تو وہ بھی چورا ہو جائے اسی لیے تو اسے سنگچور کہتے ہیں۔''

داتو ہنس کر بولا۔ ''آج کئی گیدڑوں کی موت آنے والی ہے۔''

وہ دونوں چلنے کو تھے کہ بوڑھے کی نگاہ اس لکیر پر پڑی جو گائے کے پاس سے ہو کر گزری تھی۔ وہ رک گیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو بابا؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''یہ لکیر۔''

''سانپ کی ہے۔''

''ہاں ہے تو سانپ کی مگر......!''

''مگر کیا''

''اس میں کچھ ایسی بات ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتی۔''

داتو نے اب نئی دلچسپی سے لکیر کو دیکھا مگر کچھ سمجھ نہ پایا۔ ویسے اگر بابا کہتا ہے تو پھر ٹھیک ہی کہتا ہوگا کیونکہ وہ تو لکیر سے سانپ کی نسل اور بعض اوقات تو نر اور مادہ تک کے بارے میں بتا دیتا تھا۔ ''کچھ سمجھے؟'' نوجوان نے انکار میں سر ہلایا تو اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

''یہ دیکھو۔''

اب وہ سمجھا۔ سانپ کی لکیر ریت پر ہوتی ہے مگر یہ لکیر ریت کے اندر تھی صرف کہیں سے باہر، گویا وہ ریت کی مچھلی ہو جو ریت کے سمندر میں تیرتی جا رہی ہو اور کہیں کہیں پانی سے گردن باہر نکال کر جھانک لیا ہو۔

''کمال ہے۔ میں نے ایسی لکیر آج تک نہیں دیکھی ریت کے اندر۔'' حیرت اور دلچسپی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ''یہ کیا چیز ہے؟''

''سانپ ہی ہوسکتا ہے۔''

''اگر یہ سانپ ہے تو کسی نے آج تک ایسا سانپ نہیں دیکھا جو ریت کے اندر سفر کرے۔'' اس نے انگلی ریت میں کھبو دی تو اندر سے مکمل دائرہ برآمد ہوا جو دور تک ریت میں چلتا گیا تھا۔ بوڑھے نے تعجب سے سر ہلایا' وہ جوش سے بولا۔ ''دیکھا گویا کسی نے لاٹھی ریت میں دبا کر اسے نہایت احتیاط سے کھینچ لیا ہو۔''

وہ دور تک لکیر کے کنارے چلتا گیا حتیٰ کہ جھاڑیوں تک جا پہنچا اور تب اس نے اس خوف ناک پھنکار کو اپنے پاؤں کے قریب محسوس کیا وہ اچھلا اور پھر منہ کے بل گر گیا۔ اس کی آواز سن کر داتو بھاگا آیا بوڑھے کو اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ سیاہ ناگن سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ ان آنکھوں سے عجیب مقناطیسی لہریں خارج ہو رہی تھیں ایسی لہریں جنہوں نے پاؤں جکڑ لیے جسم جکڑ لیا۔ یہ آنکھیں اسے اپنی جانب بلا رہی تھیں گویا آواز دے رہی ہوں گویا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی ہوں...... اس کی دوشاخہ زبان باہر نکلی پھر جیسے اس نے بوڑھے کو ڈسنے کا ارادہ ترک کر دیا اور جھاڑیوں میں سرک گئی۔ بوڑھا اسی طرح زمین پر گرا رہا۔ داتو اسی طرح کھڑا رہا وہ ایک ثانیہ تھا کہ صدی کچھ سمجھ نہ پائے کہ کیا ہو گیا۔ خوف ناک سرشاری کا ایسا لمحہ جو وجود کی جڑیں ہلا گیا' اس نے ایک مرتبہ پھر ان جھاڑیوں کو دیکھا جہاں اب ہوا سے پتے ہل رہے تھے۔ اس نے جھاڑیوں کے گرد دو تین چکر لگائے وہ یہ دیکھ کر چکرا گیا تھا کہ چیونٹیاں بھی ایک خاص حد تک آ کر رک جاتی تھیں' کمال ہے!

داتو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بوڑھا چلا تو اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟''

''میں سمجھ نہیں سکا مگر اس ناگن میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔'' داتو نے چلتے ہوئے بوڑھے کو نظر بھر کر دیکھا جس کا چہرہ پسینہ کی بارش سے بھیگ گیا تھا۔ بوڑھا جیسے خود سے مخاطب تھا۔ ''میں نے ساری زندگی سانپ پکڑتے گزاری ہے میں نے بڑے بڑے زہریلے سانپوں کو ان ہاتھوں سے پکڑا ہے کئی مرتبہ ڈسا بھی گیا ہوں مگر مجھے آج تک خوف نہیں محسوس ہوا۔'' وہ جھرجھری لے کر بولا۔ ''یہ پہلا موقع ہے کہ میں سانپ سے ڈرا ہوں اور شاید میری کوئی چیخ بھی نکلی تھی۔''

دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ ''شاید یہ کوئی بدروح ہو۔''

''نہیں۔'' بوڑھا قطعی لہجہ میں بولا۔ ''عورت زندگی ہی میں ناگن ہوتی ہے اس لیے مرنے کے بعد ناگن بن کر اسے کیا لینا؟'' ہنس کر بولا۔ ''ویسے ہی ہر وقت ڈستی رہتی ہے۔''

''پھر؟''

''میں کچھ نہیں سمجھ سکا لیکن جس کی ایک شُوک نے مجھے منہ کے بل گرا دیا وہ عام ناگن نہیں ہو سکتی۔''

داتو بولا۔ ''بابا! وہ تمہیں کاٹ سکتی تھی مگر اس نے کاٹا نہیں۔''

''ہاں! شاید وہ کاٹنے کو تھی مگر یوں لگا جیسے تمہیں دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا ہو۔''

''مجھے؟''

''میرا خیال ہے۔''

''کمال ہے! مگر ایک بات اور بھی ہے تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے۔''

''ہاں مجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے۔'' بوڑھے نے جھرجھری لے کر گویا اپنے آپ سے سوال کیا۔

دونوں خاموش چلتے رہے۔ داتو کی آنکھوں میں پھیلتی شام کے سائے سمٹتے جا رہے تھے جب کہ بوڑھا کبھی کبھی کانپ اٹھتا۔ بستی کے قریب پہنچے تو جانوروں اور انسانوں کی آوازوں نے ان کا استقبال کیا۔

گائے کے ڈسنے کی خبر خاصی سنسنی خیز تھی۔ یہ سپیروں کی بستی تھی ہر گھر میں دس بیس سانپ پل رہے تھے اور ان سانپوں کو پالنے والے مردوں اور ان مردوں کو سنبھالنے والی عورتوں اور ان کے ملاپ سے جنم لینے والے بچوں کے لیے سانپ خوفناک چیز نہ تھی۔ مردوں کے لیے یہ روزگار کا ذریعہ تھا' عورتوں کے لیے چاندی کے زیوارات کے بعد جہیز کی سب سے قیمتی چیز اور بچوں کے لیے کھلونا۔ انہوں نے سانپ پکڑ پکڑ کر ارد گرد کا علاقہ ان سے پاک کر دیا تھا اس لیے سانپ یہاں کہاں؟ وہ تو خود سانپ کی تلاش میں جنگل اور تھل میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اسی لیے اس سانپ کی آمد نے ساری بستی میں سنسناہٹ

کی برقی لہر دوڑا دی تھی اور پھر دودھ دینے والی گائے کا نقصان کوئی معمولی بات نہ تھی وہ پچاس سانپوں کی قیمت کی گائے تھی کوئی معمولی گائے نہ تھی۔ وہ دونوں بستی والوں میں گھرے ماجرا سنا رہے تھے بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ داتو سنا رہا تھا کیونکہ بوڑھے کو تو چپ سی لگ گئی تھی۔ گائے کا گوشت کھا کر گدھ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو یقیناً یہ بے حد زہریلا ناگ ہوگا۔ اس پر پہلی بار بوڑھا بولا۔ ''ناگ نہیں ناگن۔''

''ناگن کیسے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' بوڑھا بولا۔ ''لیکن وہ ناگن ہے۔'' وہ سب اسے کھڑے گھور رہے تھے۔ ''مگر مجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ناگن ہے۔'' بوڑھا جیسے خود سے سوال کر رہا ہو۔ ''لیکن اس کے باوجود مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ناگن ہے۔ ناگن بھی نہیں عورت۔'' وہ ایک لمحہ کو رکا اور پھر طویل سانس لے کر بولا۔ ''ہاں ہاں وہ عورت ہے..... مجھے یقین آ گیا وہ عورت ہی ہے۔''

''یقیناً! یہ ڈر گیا ہے۔'' ایک عورت بولی۔

''ہاں!'' وہ بولا۔ ''میں واقعی ڈرا ہوں۔'' وہ جھرجھری لے کر بولا۔ ''میں نے آج تک ایسی شوک نہیں سنی۔''

''بابا ٹھیک کہتا ہے۔'' داتو بھی بولا۔ ''یہ تو منہ کے بل گر گیا تھا۔''

''یا پیر!'' مجمع میں سے کوئی بولا۔

''عجب بات ہے۔'' بوڑھا پھر بولا۔ ''وہ مجھے کاٹنے کو تھی۔ میں نے اس کا منہ کھلتے اور زبان لہراتی دیکھی تھی مگر پھر جیسے اس نے ارادہ تبدیل کر دیا۔''

''کمال ہے۔'' کسی کی آواز نے مجمع کی حیرت کے آئینہ کو توڑا۔

اس رات ہر گھر میں یہی موضوع تھا۔ سپیروں میں جوش پیدا ہو گیا تھا اور ہر ایک اس نایاب اور بے حد خطرناک ناگن کو پکڑنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ ویسے تو سانپ پکڑنا ان کے معمولات میں سے تھا اور اب اس کام میں کوئی انوکھی لذت نہ رہی تھی لیکن بابا نے جن الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا تھا اس سے وہ ناگن محض ناگن نہ رہی تھی بلکہ ایک پُراسرار وجود میں تبدیل ہو گئی تھی اب یہ محض ایک ناگن پکڑنے کی بات نہ تھی بلکہ کسی اور جنم کی مخلوق

قابو میں کرنے والی بات تھی' کسی خزانہ کی تلاش یا حسینہ کو اڑانے والی بات تھی...... سو سبھی جوش میں تھے۔

اس رات بابا نہ سو سکا! ناگن گویا نگاہوں کے سامنے لہرا رہی تھی اس کی دوشاخہ زبان اور اس کی شوک۔ اس تصور سے ہی وہ لرز لرز جاتا اور سب سے زیادہ اس بات سے پریشان تھا کہ وہ خوفزدہ کیوں ہے' وہ زندگی میں کبھی کسی سانپ سے نہ ڈرا تھا۔ وہ تو راتوں کو جنگلوں میں پچھلی پائیوں سے بھڑ جانے والوں میں سے تھا اور اب ایک شوک نے اسے پانی بنا دیا۔ اسے ہر قیمت پر پکڑنا ہوگا اس نے تہیہ کیا اور نہیں تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ اس سے خوفزدہ ہو گیا تھا آخر اپنا خوف بھی تو دور کرنا تھا اس لیے ہر قیمت پر...... حتیٰ کہ جان کی قیمت پر بھی اسے پکڑنا ہوگا۔

جب رات خاصی بیت گئی اور بستی کے مرد عورت بچے اور ان کے ساتھ ساتھ جانور بھی سو گئے تو داتو نے گردن اُٹھا کر آسمان کو دیکھا کہکشاں اب کھجور کے جھنڈ پر تھی...... وقت ہو گیا ہے اس نے سوچا اور کواڑ بھیڑ کر چپکے سے گھر سے نکلا' خاموش بستی سے وہ ایک سایہ کی مانند گزر رہا تھا کہ پاؤں کے نیچے کنکر بھی نہ ہلنے پائے۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس تھیں اور وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں پہنچنا ہے وہ سانس روکے آہٹ لیتا چلا جا رہا تھا۔

بستی کے کنارے پر کنوئیں کے ساتھ کھجوروں کے جھنڈ میں زینا اس کی منتظر تھی وہ اندھیرے میں کسی درخت کے تنے کی طرح ساکت تھی۔ اسے آتا دیکھ کر تنے سے الگ ہو کر اس کی طرف بڑھی اور پھر قریب آ کر جیسے ٹھٹھک گئی۔ ''داتو؟''

وہ اس کے ہاتھوں میں پگھل رہی تھی۔

''داتو! داتو۔'' وہ بار بار بے چین ہو اٹھتی۔ ''داتو! داتو!!''

اور پھر ساکت ہو گئی۔ دونوں خاموش تھے صرف تیز سانسیں کچھ کہہ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں زینا۔''

''نہیں کچھ تو ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''پھر.....؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم ایسے تو کبھی بھی نہ تھے۔''

''ہاں! میں ایسا تو کبھی بھی نہ تھا۔''

''کیا کوئی اور.....''

''نہیں زینا۔'' وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ ''صرف تم ہی میری عورت ہو۔''

''تو پھر آج؟''

وہ چپ رہا۔

''ہم تو کئی راتوں بعد ملے تھے، میں آج سارا دن خوشی سے باؤلی باؤلی سی پھرتی رہی اور تم، تم۔''

وہ پھر بھی چپ رہا۔

''کیا زیادہ تھک گئے تھے!'' وہ ہمدردی سے بولی۔

''نہیں تو۔''

''پھر؟''

''زینا میں سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟'' وہ اس کے ہاتھ کو اپنے گال پر رگڑ رہی تھی۔

''میں ناگن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''کون سی ناگن۔'' وہ ابھی تک اس کے ہاتھ سے کھیل رہی تھی۔

''وہی جس نے آج گائے کو کاٹا ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر تعجب سے بولی۔ ''اس کے بارے میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ صبح جا کر اسے پکڑ لینا۔''

''نہیں زینا یہ اتنی سیدھی بات نہیں۔'' وہ جیسے خود کو سمجھا رہا تھا۔ ''اس میں کوئی خاص بات ہے۔''

''خاص بات کیا ہوتی۔'' وہ بولی ''بھئی عام ناگنوں جیسی ناگن ہے بابا کیونکہ ڈر

گیا اس لیے تم بھی اس کے بارے میں اتنا سوچ رہے ہو۔''

''نہیں زینا اس میں کوئی خاص بات ہے۔'' وہ پھر بولا۔ ''میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔''

''ہا!'' وہ تمسخر اڑانے والے لہجہ میں بولی۔ ''میری آنکھیں تو دیکھتے نہیں اور ناگن کی آنکھوں میں جھانکتے پھرتے ہو۔''

مگر وہ جیسے اس کی بات سنے بغیر بولے جا رہا تھا۔ ''اس کی آنکھوں میں سے عجب لہریں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں گویا مقناطیس کی ڈوریاں ہیں جو مجھے جکڑ رہی ہیں وہ گول آنکھیں نہ تھیں کنواں تھیں کہ میں ڈول کی طرح ان میں اترتا چلا گیا۔'' زینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ جھرجھری لے کر بولا۔ ''زینا! نہ جانے کیا تھا ان آنکھوں میں۔''

زینا نے داتو کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر اندھیرے میں یہ بھی ممکن نہ تھا وہ بالآخر بولی۔ ''داتو! تم تو کملے ہو۔ کملے!''

''شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔''

وہ دونوں خاموش، دو پریشان بچوں کی مانند ایک دوسرے کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ جیسے اپنا اپنا ڈر دور کر رہے ہوں۔ داتو کے جسم کی گرمی زینا کو عجب سکون دے رہی تھی مگر داتو کو زینا کے جسم کا احساس بھی نہ تھا، ٹھنڈا اپنڈہ، کسی اور کا لگتا تھا! آج کی ملاقات سے زینا خوش نہ تھی، وہ پریشان تھی۔ یقیناً یہ کسی اور کے چکر میں پڑ گیا ہے یا پھر مجھ سے اکتا گیا ہے مگر نہیں مجھ سے کیسے اکتا سکتا ہے!

وہ اکتائے ہوئے لہجہ میں بولی۔ ''دیر ہو رہی ہے چلیں؟''

''ہاں۔'' وہ جیسے چونک کر بولا۔ ''دیر ہو رہی ہے۔''

وہ راستہ بھر یہی سوچتی رہی کہ داتو کو کیا ہو گیا ہے یہ ناگن کا کیا چکر ہے۔۔۔۔ بابا بھی بے حد خوفزدہ تھا یہ بھی کملی باتیں کر رہا ہے۔ ناگن ناگن ہوتی ہے پکڑ کر پٹاری میں بند کرنے کے لیے۔ تماشہ دکھانے کے لیے، بیچنے کے لیے، جہیز میں دینے کے لیے۔ یہ کس چکر میں پڑ گیا ہے۔ داتو کا پیار اس کے سینہ میں دل بن کر دھڑک اٹھا۔ وہ دیواروں کے سائے میں چلتی جا رہی تھی اپنے سائے سے بھی بچ کر۔ تو کیا میری سوت ناگن بنے گی! یہ سوچ کر

وہ خود ہی ہنسی، میں بھی کملی ہوگئی ہوں کیا سوچ رہی ہوں۔ میں تو عورت کو جان سے ماردوں ناگن تو پھر بھی پاؤں تلے کچلی جاسکتی ہے۔ میرے غصہ کے آگے اس رسی کی کیا حقیقت! اور عین اسی وقت اس نے اپنے سامنے ناگن کو دیکھا وہ اپنے پورے قد پر کھڑی تھی۔ ....زینا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ یہی وہ ناگن ہے جس کی وجہ سے داتو پریشان ہے اور جس سے بابا خوفزدہ ہے مگر میں عورت ہوں اس سے کیوں ڈروں! یہ ناگن اور میری سوت! ہنھ یہ میری دشمن! ہنھ!

سب ایک ثانیہ میں ہوگیا ذہن میں ابھی سوچ کے بلبلے ابھر رہے تھے کہ ناگن کی شوک خاموش بستی میں گونجی اور ساتھ ہی زینا کی چیخ...... ایسی چیخ جو آج تک اس بستی کی کسی عورت کے حلق سے نہ نکلی تھی۔

یقیناً اس بستی پر آسیب کا سایہ ہے ہر شخص یہی سوچ رہا تھا ورنہ ناگن کو بس میں کرنا کوئی ایسی ناممکن بات نہ تھی۔ وہ بستی جس کا روزگار سانپ ہوں، وہ بستی جہاں کے بچوں کا کھلونا سانپ ہوں اور وہ بستی جہاں سانپ بہترین جہیز ہوں اس بستی کے ماہر سپیرے اس ناگن کو نہ پکڑ سکیں، کمال ہے۔ یقیناً وہ کوئی بدروح ہے ورنہ اب تک پکڑی جاچکی ہوتی۔

زینا کی موت نے بستی کے اعصاب پر ناگن سوار کردی۔ وہ زینا جو زندگی سے شرابور تھی اور کاجل جس کی آنکھوں سے سیاہی ادھار مانگے وہ زینا یوں ماری جاسکتی ہے۔ یہ کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔ داتو اگرچہ اس کی موت سے ہل کر رہ گیا تھا مگر اس کے دل میں ناگن کے لیے نفرت یا غصہ یا انتقام کے جذبات نہ تھے بلکہ عجب سکون کا احساس ہو رہا تھا گویا ناگن نے اس کی مشکل آسان کردی ہو۔ ہرچند کہ زندگی میں وہ اسے کبھی بھی مشکل نہ محسوس ہوئی اور نہ ہی اس نے کبھی داتو کو کسی مشکل میں ڈالا پھر بھی اس کی موت سے وہ خود کو جیسے آزاد سا محسوس کررہا تھا مگر آزادی کس بات کی! یہ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی!

ساری بستی کے مردوں پر جیسے زینا کی موت کا انتقام جنون بن کر سوار ہوگیا مگر ان کی بہترین کوششیں اور تمام مہارت رائیگاں گئی، سب نے منہ کی کھائی کہ ناگن کو پکڑنا تو کجا وہ اس کی لکیر تک نہ دیکھ پائے۔ ان کوششوں سے صرف دو اشخاص غیر متعلق رہے ایک بابا اور دوسرا داتو۔ اگرچہ ان دونوں میں کبھی ناگن کے موضوع پر بات نہ ہوئی مگر دونوں کی

چپ ان کے اندرونی اضطراب کی غماز تھی۔ دونوں صبح گھر سے نکلتے اور باقی سپیروں والا راستہ چھوڑ کر دوسری سمت جاتے۔ جہاں سانپ ملنے کا امکان نسبتاً کم تھا۔

زینا کی موت کا انتقام نہ لیا جا سکا۔

داتو کئی دن بخار میں پھنکتا اور بدبودار بوٹیوں کا بدمزہ پانی پیتا رہا تھا آج ٹھیک ہو کر اٹھا تو کمزوری سے جیسے چکر آ گیا مگر تنہا گھر میں لیٹے لیٹے طبیعت میں اتنی بیزاری اور اکتاہٹ آ چکی تھی کہ اب گھر میں بیٹھنے کی سکت نہ تھی۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ گھروں کے باہر بچے کھیل رہے تھے اور اندر عورتیں ریندھنے میں مصروف' کچھ بوڑھے بیٹھے حُقہ پی رہے تھے الغرض! بستی کی زندگی اپنے معمول کے مطابق تھی۔ زینا کی موت اور ناگن بھی کسی حد تک فراموش کی جا چکی تھی سپیروں کے لئے سانپ کے کاٹنے کی موت ویسے ہی معمولات کی تھی جیسے ملاحوں کے لیے پانی کی! زینا کی موت کا انتقام لے لیا جاتا تو اچھا ہوتا مگر وہ ناگن نہ پکڑی جا سکی تو سائیں کی مرضی' صحرا میں سانپوں کی کمی نہ تھی اور عمر سانپ پکڑنے ہی کے لیے تھی۔

داتو کو آج بخار کے بعد' کمزوری سے کانپتی ٹانگوں کے باعث زینا بُری طرح یاد آ رہی تھی۔ آج اس نے صحیح معنوں میں اس کی کمی محسوس کی تھی کہ زینا کھوئی طاقت بحال کر سکتی تھی' گائے کے تھنوں سے نکلے تازہ اور نیم گرم دودھ کا کٹورا پیا تو جسم کو قدرے بہتر محسوس کیا' اِدھر اُدھر بیٹھ کر لوگوں سے گپ کی مگر مزا نہ آیا طبیعت میں عجیب سی الجھن تھی جس کا بخار یا اس کی کمزوری سے کوئی تعلق نہ تھا' جیسے کسی چیز کی کمی کا احساس ہو زینا کی کمی ہو؟ مگر یہ احساس زینا کی کمی کا بھی نہ تھا۔ جیسے کچھ کرنے کو جی چاہے مگر یہ نہ معلوم ہو کہ کیا کرنا ہے یا پھر بھوک ہو مگر یہ نہ معلوم ہو کہ کیسے یہ بھوک مٹے گی۔

بخار نے منہ کا ذائقہ بھی خراب کر دیا تھا اس لیے سوچا چلو نیم کے درخت سے داتن توڑ کر منہ کی کڑواہٹ ہی دور کر لوں' بدمزہ منہ میں نیم کی کڑواہٹ نے گھل کر عجب اثر کیا کہ طبیعت قدرے بہتر ہوتی محسوس کی' وہ چلتا گیا۔

اب بستی اس کی پشت پر تھی!

غرب ہوتے سورج کی کرنوں نے افق کو دہکا کر زروں کو سنہری تاج پہنا رکھے

تھے۔ پانی کی چمک والی ریت لہروں پر اس کے قدموں کے نشانات بنتے جا رہے تھے۔ سورج ریت کے جھلمل جھلمل کرتے سمندر میں اترتا جا رہا تھا۔ چاروں اور خاموشی تھی صرف کبھی کبھی کوئی پرندہ تیزی سے پر مارتا گزر جاتا۔ پھر آسمان کی نیلاہٹ پر رات کا ہاتھ پھر گیا اور وہ چاند جو افق پر تصویر کی مانند تھا جیسے اپنی چاندنی سے زندہ ہو گیا۔

وہ ٹھنڈی ریت پر بیٹھا رہا' ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے جسم سے بخار کی بدمزگی دھوئے جا رہے تھے' اس نے ٹھنڈی ریت سے مٹھی بھری اور دبایا تو ریت نے عورت کی طرح لمس دیا۔ مٹھی میں سے ریت آہستہ آہستہ کھسکتی جا رہی تھی اور پھر مٹھی خالی رہ گئی۔ اس نے پھر ریت سے مٹھی بھری اور پھر اسے خالی کیا' پھر بھری اور پھر خالی کیا...... وہ بچہ بنا اسی کھیل میں مگن رہا۔

صحرا میں تا حدِ نگاہ چاندنی کا کھیت تھا جس میں کبھی کبھی کوئی ذرہ جگنو کی طرح چمک اٹھتا۔ اس کا جی مچل اٹھا کہ ان جگنوؤں کو پکڑے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جیسے جسم میں خنک توانائی بھر رہے ہوں' اب وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اور پھر وہ لیٹ گیا دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے خاموش صحرا میں ریت کے بستر پر لیٹا وہ چاند کو تکتا رہا' تکتا رہا' تکتا رہا۔ اس نے زندگی میں خود کو کبھی بھی اتنا پُرسکون محسوس نہ کیا تھا گویا وہ چاندنی میں نہیں بلکہ سکون کی بارش میں نہا رہا ہو۔ اس نے خود کو' صحرا کو' ریت کو اور چاند تاروں سب کو ایک محسوس کیا۔ جیسے صحرا کے سینہ میں اس کا دل دھڑک رہا ہو جیسے اس کی رگوں میں ریت موجزن ہو۔ جیسے اس کے وجود کی روشنی سے صحرا میں اجالا ہو اور وہ محض ایک انسان نہ ہو بلکہ ریت کا ایک ذرّہ ہو۔ ریت کے سمندر کی موج ہو بلکہ خود صحرا ہو۔

نہ جانے اس پر نیند نے کب غلبہ پالیا اور وہ کب سویا کتنا سویا اسے کچھ احساس نہ تھا ہاں آنکھ کھلی تو چاندنی کے فرش پر ناگن کا پھول کھلا تھا' دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے خود کو ناگن کی آنکھوں کے سرخ بھنور میں ڈوبتے پایا اس کی دوشاخہ زبان لہرائی مگر دا تو نہ تو اس زبان سے خوفزدہ ہوا اور نہ ہی آنکھوں کے بھنور سے ہراساں۔ دو آنکھیں سرخ سیاہ گول بادامی یوں ملیں کہ وہ ایک دوسرے میں ڈوبتے گئے' دوشاخہ زبان پھر لہرائی مگر اس میں بجلی بن کر گرنے والا غصب نہ تھا بلکہ عجب سندرتا تھی ایسی من موہنی کہ من پنچھی

باؤلا ہو جائے۔

وہ ایک پل تھا کہ یگ' کون جانے' سمے کے پُل پر سے صدیاں گزر گئیں یا لمحہ منجمد ہو گیا' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ آنکھ آنکھ کی تصویر بنی تھی اور بس!

داتو کو اس کے جسم سے عجب حرارت نکلتی محسوس ہو رہی تھی ایسی تپش جو کسی لکڑی سے نہ نکلی تھی۔ ایسی آنچ جو گرم ریت میں نہ تھی۔ ایسی گرمی جو کسی عورت کے جسم نے خارج نہ کی تھی' خارج کرنا تو دور کی بات یہ گرمی تو عورت کو لاکھ کی مانند پگھلا دے' بہا دے! داتو کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے گرد حرارت کا ایک حصار بنتا جا رہا تھا' ہوا کی خنکی کے باوجود اسے پسینہ آ رہا تھا وہ خود کو ٹھنڈی ریت کی بجائے جلتی بھوبل میں پھنکتا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی تپتی آنکھوں نے اسے جھومتے دیکھا وہ یوں جھوم رہی تھی گویا داتو کا جسم بین میں تبدیل ہو گیا ہو اور سُر اس کے مساموں سے پھوٹ رہے ہوں۔ داتو اس کی شوک کو اپنے چہرہ کے قریب محسوس کر رہا تھا۔ دوشاخہ زبان لہرا رہی تھی اور سرخ بھنور طوفان میں تبدیل ہو رہا تھا...... وہ جھومتی جا رہی تھی۔ ہلتے سر کی پھیلتی قوس سے دائرہ بنتا جا رہا تھا۔ اس کا پورا وجود اب اپنے دائرہ کا اسیر تھا' دائرہ میں دائرہ' بھنور میں بھنور' آنکھ میں آنکھ! وہ اپنے پورے وجود پر کھڑی ناچ رہی تھی۔ دوشاخہ زبان لہرا رہی تھی' بے چینی کے عالم میں! بے کلی کے عالم میں' مگر دونوں کی آنکھیں جس تار سے بندھی تھیں وہ نہ ٹوٹنے پایا کہ آنکھوں کا یہ تار سمے کی ڈوری تھی جس سے وہ دونوں بندھ چکے تھے۔

داتو ساکت تھا' بت بنا' صرف اس کی آنکھوں میں جان تھی اس لیے کہ اس میں اس کی نرت کی جھنکار تھی۔ وہ اچانک رُکی' ایک پل جیسے ہوا میں معلق رہی اور پھر وہ اس کے قدموں میں ڈھیر تھی۔ اب اس کا رنگ سیاہ نہ رہا تھا بلکہ اس کے وجود پر اندر دھنش کے تمام رنگوں کے پھول کھل اُٹھے تھے۔ ان رنگوں سے عجب روشنی خارج ہو رہی تھی یوں کہ آنکھ بھر کر دیکھنا محال تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی آنکھوں میں بھی رنگوں کے بھنور مچلتے نظر آئے' اس کی آنکھ کچھ کہہ رہی تھی! کیا؟ پل کی کہانی' سمے کی کتھا' صدیوں کی حکایت۔

داتو نے دوشاخہ زبان اپنے تلووں پر محسوس کی۔ اس کی زبان ہولے ہولے اس

کے تلوے سہلا رہی تھی۔ وہ دم سادھے لیٹا تھا وہ چاہتا بھی تو اُٹھ نہ سکتا کہ اس عجیب لمس کی زنجیر سے بندھا تھا..... وہ زبان بڑھتی جا رہی تھی تلوے ٹخنے، پنڈلیاں اور رانیں، اس کے جسم پر اس کا جسم ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کا جسم داتو کو اپنے رنگوں میں رنگ رہا تھا۔ داتو کا جسم لذت کے سیلاب میں تنکہ بنا بہہ رہا تھا۔ وہ لذت کی آندھی میں پتہ بنا اڑا جا رہا تھا۔ اس نے اب داتو کو پوری طرح اپنے جسم کے حصار میں لے رکھا تھا اس کو سہلا رہی تھی، سینہ کے بالوں میں سرسرا رہی تھی، دل کی دھڑکن کے ساتھ دھڑک رہی تھی اور گلے کا ہار بنی تھی۔ اس نے داتو کے منہ پر اپنا منہ رکھ دیا۔ دونوں زبانیں ایک ہو گئیں اور پھر وہ دونوں ایک ہو گئے۔ فضا میں رنگوں کی پچکاریاں تھیں کہ اندر دھنش زمین پر اتر آئی تھی۔

سانپ ندی میں سانپ جل تھا۔ سانپ جل میں سانپ امرت تھا، سانپ بیل میں سانپ پتے تھے، سانپ کلی میں سانپ پھول تھا۔ سانپ پنکھڑی میں سانپ رس تھا، سانپ پھل میں سانپ من تھا۔

وہ ناگ شجر کے سایہ میں تھے، ناگ شاخوں پر پھن پھول کھلے تھے اور دونوں پھن پھولوں کی بارش میں تھے۔

O.....O.....O

سویٹ ہارٹ

وہ اچانک ہی سامنے آ گئی میری کار کی ہیڈ لائیں پڑتے ہی دوسری کار والوں نے اپنی لائٹس آن کر دیں۔ ایک لمحہ کے لیے تو میری آنکھیں چُندھیا کر رہ گئیں اور ہاتھ جیسے سٹیرنگ پر سے ہٹ گیا لیکن دوسری کار کے ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے موڑ کاٹا اور جب میں نے مُڑ کے پیچھے دیکھا تو ایک ثانیہ کو کار کی پچھلی بتی ایک جھلک دکھا کر گم ہو گئی جیسے اندھیرے میں سگریٹ کا آخری کش۔

میں نے ایک طویل سانس لی۔

جلتے سگریٹ کو باہر پھینک کر میں نے کار کی رفتار کم کر دی۔ دراصل مجھے آج کل کچھ زیادہ ہی سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی اور سوچتے وقت انجانے میں کار کی رفتار تیز ہو جاتی۔ میں تو چاہتا تھا کہ نہ سوچوں لیکن ذہن جیسے ایک بے بس نیا کی مانند پریشان خیالات کے بھنور میں گھرا ہوا ہے۔ کچھ عجیب سی حالت ہو گئی ہے۔ سگریٹ پیتا ہوں تو اس کا نیلگوں دھواں جیسے خطوط کی صورت اختیار کر کے ایک جانے پہچانے چہرے کے نقوش کی یاد دلاتا۔ چائے کی پیالی سے اُٹھتی بھاپ کسی کی گرم سانسوں کی یاد دلاتی' اور سکاچ...... کم بخت سکاچ گھڑی بھر کر تو سب کچھ بھلا دیتی لیکن اس کے بعد پھر وہی خیالات اور وہی چہرہ...... جسے میں اب بھلانا چاہتا ہوں۔

سامنے کلب کی عمارت تھی۔ یوکلپٹس کے درختوں میں گھرا ہوا کلب آج رنگین بلبوں اور نیون سائنز سے جگمگا رہا تھا۔ ہیپی کرسمس کے روشن حروف کسی طرحدار حسینہ کی

مسکراہٹ ایسے نظر نواز تھے۔ دروازہ پر ویل کم لکھا تھا۔ کھڑکیوں کے رنگین پردے اور آرکسٹرا کی دُھن واقعی ویل کم کہہ رہی تھی۔

میں جب کار کی چابی احتیاط سے جیب میں رکھ کر باہر نکلا تو سرد ہوا نے گویا گالوں پر طمانچہ مارا مگر یہ طمانچہ بُرا نہ لگا۔ دراصل میرا سارا جسم آگ بن رہا تھا۔ مجھے خود میں سے شعلے سے نکلتے محسوس ہو رہے تھے اور ایسے میں اس ٹھنڈی ہوا نے گویا میرے جلتے گالوں اور تپتی پیشانی پر کسی نرس کی طرح اپنا شفیق ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے چاہا کہ ٹائی اُتار کر قمیض کا گریبان کھول دوں اور سرد ہوا سے بھٹی ایسے سینہ کو ذرا سہلا لوں لیکن ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے دو چار لمبے لمبے سانس لے کر پھیپھڑوں سے سگریٹ کے دھوئیں کی کثافت دُور کرنے کی کوشش کی۔

پہلے میں جس کلب میں بڑے شوق سے جاتا تھا اب وہاں جانے کو دل نہ مان رہا تھا مگر جاؤں تو جاؤں کہاں' کیونکہ یہ کلب ہی میری ہمدرد اور غمخوار رہی تھی۔ جب میں بہت خوش ہوتا تو خوشی کا جشن منانے یہاں بھاگ آتا اور جب میں اُداس' افسردہ اور ملول ہوتا تو غم غلط کرنے یہاں آ جاتا...... اور آج تو میں واقعی اُداس تھا۔

نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے گیٹ کراس ہی کیا تھا کہ سامنے سے وقار آتا دکھائی دیا۔ حسبِ معمول اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی اور اصول کے مطابق کوئی نیا ہی چہرہ تھا وہ میرے گلے سے لپٹ گیا۔

''ظالم! تم کہاں رہے اتنے عرصہ تک؟''

''وہی بزنس کا چکر''

''لعنت ہو تمہارے بزنس پر۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ وہ جلدی سے بولا۔ ''ان سے ملو لُوسی! یہ وہ میرا نامعقول دوست ہے جس کا میں نے بارہا ذکر کیا تھا...... اور یہ ہے مسِ لُوسی۔''

میں نے بڑے تپاک سے مِس لُوسی سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ نرم بھی تھا اور گرم بھی۔ اس نے ہیوی میک اپ کر رکھا تھا۔ سیاہ بال' بھوری آنکھیں' گہری سرخ لپ اسٹک'

بلیو سکرٹ اور پیلے جُوتے...... وہ دُور سے کسی دکان کا سائین بورڈ معلوم ہوتی ہو گی مگر نزدیک سے ابسٹرکٹ پینٹنگ کے لتھڑے ہوئے رنگوں کا تاثر دے رہی تھی۔

اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے ایک مرتبہ ایسے دیکھا جیسے انشورنس ایجنٹ کسی متوقع گاہک کو جانچتا ہے۔

ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے چل دیئے۔ وقار نے اپنے لیے ایک میز مخصوص کروا رکھی تھی۔ راستے میں اور بھی کئی لوگ ملے۔ میز پر بیٹھ کر وقار نے پوچھا۔

''تم اکیلے ہو؟''

''ہوں''

''کیوں؟''

''ویسے ہی......''

''وہ یاد آتی ہے؟''

مِس لُوسی ننھے سے آئینہ میں اپنی ناک پر پف پھیر رہی تھی۔ اس نے آئینہ کو سامنے سے ہٹا کر میری طرف بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے جواب نہ دینے ہی میں عافیت سمجھتے ہوئے مِس لُوسی سے پوچھا۔

''میری وجہ سے آپ ڈسٹرب تو نہ ہوں گے۔''

''بالکل نہیں۔'' اور لپ اسٹک لگے سُرخ ہونٹوں کے عقب میں سے اس کے سفید دانتوں نے ایک جھلک دکھائی۔ دانت اچھے تھے مگر اتنے نہیں کہ ان سے بازو پر کٹوانے کو دل چاہے۔

آرکسٹرا نے ایک تیز جھنکار کے ساتھ ٹیون ختم کی اور رقصاں جوڑے جیسے عالمِ مدہوشی میں ایک لمحہ کے لیے ٹھٹک گئے۔ پھر وہ سب تالیاں بجاتے ہوئے اپنی اپنی میزوں کی طرف بڑھ گئے۔ تمام میزیں بھری تھیں۔ بیرے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ میں یونہی بے مقصد سب پر نگاہیں دوڑا رہا تھا۔ آرکسٹرا خاموش تھا صرف ایک آدمی وائلن بجا رہا تھا۔ وہ بہت پیاری دُھن تھی کیونکہ عورتیں بھی سانس بند کیے سُن رہی تھیں۔ وقار خاموشی سے اپنے گلاس کے کناروں سے کھیل رہا تھا اور مس لوسی کی بھوری آنکھیں گویا چاکلیٹ

بن گئی تھیں مگر مجھے یہ دُھن نہ بھائی۔ یہ دُھن ہوا کی طرح ماضی کی راکھ سے یادوں کی چنگاریاں کُریدرہی تھی۔شریرانگلیوں کی مانندایک ایسے پردے کوسرسرارہی تھی جس کے دروازے کومقفل کر کے اس کی چابی گنوادی گئی ہو۔میں نے بے اختیار ہوکر سکاچ کا گلاس منہ سے لگالیا۔

وائلن خاموش ہوگئی' سب خاموش تھے اوراس کے بعد پورا آرکسٹراایک دم سے بجنے لگا۔وقار نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔میں نے انکار کے طور پر سگریٹ سلگالی' اس نے مس لُوسی کا ہاتھ پکڑااوروہ دونوں فلور پر پہنچ گئے۔میں سگریٹ کے دھوئیں میں سے انہیں دیکھتارہا۔وہ اچھاناچتی تھی۔اس کی کمر کے گرد وقار کے بازو کا گھیرا کافی تنگ تھا۔اس کی کمروقار کے کوٹ کے دوسرے بٹن تک آتی تھی۔اونچی ایڑی کے سینڈلوں میں اس کے ٹخنے کی ہڈی کا اُبھاردلکش تھا۔سِلک سٹاکنگ میں اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں گویا موسیقی کے زیروبم کے ساتھ اُبھراورڈوب رہی تھیں اور کمر کے نیچے کا ابھارسکرٹ کی پلیٹوں میں سے کھسک کھسک جاتا تھا۔

میں نے وقار کے گلاس کوبھی خالی کردیااورگلاس کومیز پررکھتے ہوئے یہ تسلیم کرلیا کہ میں آج واقعی اُداس ہوں۔آج رات بارہ بجے نیا سال جنم لے گا۔گھڑی کی طرف دیکھاتوابھی اس کے جنم لینے میں تقریباً اڑھائی گھنٹے باقی تھے۔سوچا گھرواپس چلا جاؤں' لیکن پھرخیال آیاتنہا گھراوراکیلا بستربھی توبورکرے گا۔

میں نے ایک نیا پیگ تیارکیاہی تھا کہ ڈانس ختم ہوگیااوروہ دونوں ہنستے ہوئے واپس آگئے۔اگلاڈانس میں نے مس لُوسی کے ساتھ کیا وہ واقعی اچھاڈانس کرلیتی تھی۔میں نے جب تعریف کی تووہ خوش ہوکر بولی۔''میں توروک اینڈ رول بھی کرلیتی ہوں۔''

''وہ کس سے سیکھا''

''اپنے ڈیڈی سے''

''تم اپنے ڈیڈی کے ساتھ......؟''

''نہیں!یہ بات نہیں' وہ ڈانسنگ کلاسز لیتے ہیں' اس لیے میں ہرقسم کے ڈانس کرلیتی ہوں۔''

''اور پھر لوگوں کو ڈانس کراتی ہوگی۔''

''یُو ناٹی!'' اس نے مُسکرا کر میری طرف منہ اٹھا دیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی نہ لگی کیونکہ اس کے مسوڑھے نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود اس کے ہونٹ اچھے تھے۔ خصوصاً نچلا ہونٹ' جو قدرے بھاری تھا۔ بے خیالی میں میری ناک اس کے بالوں سے چھو گئی مگر اس نے بُرا نہ مانا۔ میں نے فوراً چور نظروں سے وقار کی طرف دیکھا مگر وہ ہماری طرف نہ دیکھ رہا تھا۔ گو یہ نادانستہ طور پر ہوا تھا مگر پھر بھی میں خود کو بڑا بُرا سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف میرے بہترین دوست کے ساتھ تھی بلکہ میں خود بھی تو اُداس تھا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

''ایک بات پوچھوں۔''

''ہوں۔''

''تم کس کے لیے اُداس ہو؟''

''یُو ناٹی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کیا میں اُداس نظر آتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''کہہ نہیں سکتی۔''

''تو پھر......؟''

''وقار جو کہتا تھا۔''

''آل رائیٹ..... میں اُداس ہوں۔''

''کیسی تھی وہ؟''

''تم سے زیادہ خوبصورت تھی۔'' میں نے اسے جلانا چاہا مگر وہ صرف مُسکرا دی' مجھے اب بھی اس کی مُسکراہٹ اچھی نہ لگی۔

''تم اس سے محبت کرتے ہو۔''

''شاید۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ بھوری آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ صرف عورتوں کے فطری تجسس کے تحت یہ سب کچھ پوچھ رہی تھی۔

''تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''یوں ہی۔''

''تم جانتی ہو اس وقت میرا دل کیا چاہتا ہے؟''

''کیا؟''

''میں تمہیں چومنا چاہتا ہوں۔''

''یو ڈرٹی۔۔۔ تم ذرا کوشش تو کرو۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔ اتنے میں ڈانس ختم ہو گیا اور ہم واپس آ گئے۔ میز پر آ کر اس نے اپنی شیمپین پی اور پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ وقار بولا۔ ''کیا باتیں ہوتی رہیں۔'' میں نے اسے سب کچھ بتا دیا وہ بولا۔ ''اسے ساتھ لے جاؤ۔''

''احمق ہو تم تو''

''تمہیں آج ہوا کیا ہے؟''

''میں اسے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''ویلما کو؟''

''ہاں۔''

''سینی ٹوریم گئے تھے۔''

''ہاں۔''

''پھر......؟''

''پھر کیا...... بہت بُری حالت ہے اس کی۔ شاید نہ بچ سکے۔''

وہ خاموش ہو گیا اس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا اور لائٹر سے سلگا کر ایک دو طویل کش لیے۔ اس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔ اس نے سگریٹ کو احتیاط سے ایش ٹرے کے کنارے پر لگایا اور کہنے لگا۔ ''ایسی عورتوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''تم بھی یہی کہتے ہو؟'' مجھے اس کی یہ بات واقعی بُری لگی۔

''سبھی یہی کہتے ہیں!'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''تم تو سدا کے احمق ہو بھلا ایسے معاملات میں کوئی یوں اپنی جان کو روگ لگا لیتا ہے۔ اس کی ٹی بی کے غم میں خود کو کیوں ٹی بی لگا لو۔'' میں خاموش رہا۔ وہ پھر کہنے لگا ''جو عورت اپنے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھتی اس کا

انجام کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کتنی پی جاتی تھی، کتنے سگریٹ پھونک دیتی تھی۔"

"اسے ٹی بی اس وجہ سے نہیں ہوئی۔"

"تو پھر......؟"

"ایک غم اسے دیمک کی طرح چاٹ گیا۔" اس نے بیزاری سے کندھے اچکائے "محض میلوڈراما" اتنے میں مس نوسی واپس آ گئی اور اگلے ڈانس میں وہ دونوں پھر اکٹھے تھے۔

محض میلوڈراما...... میں نے وقار کے ان الفاظ کو اپنے ذہن سے خارج کر دینا چاہا۔ تو کیا سینی ٹوریم میں خون تھوکنے والے سینے کے تمام ارمان محض میلوڈراما تھے؟ کیا اس کی موت میلوڈراما ہوگی اور اس کے لیے میری اُداسی بھی میلوڈراما ہے؟

میں ویلما سے پہلی مرتبہ اسی کلب میں ملا تھا۔ میں بزنس کے سلسلہ میں کافی مدت باہر رہ کر واپس آیا تھا۔ میں اور وقار باہر لان میں بیٹھے گپوں میں مشغول تھے کہ ویلما آ گئی۔

میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

پرم کیے بالوں کی ایک لٹ جان بوجھ کر صندلیں پیشانی سے کھیلنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی سیاہ آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی خوابگوں آنکھیں۔ یوں معلوم ہوتا جیسے ابھی کسی نے کچی نیند سے جگا دیا ہو اور وہ حیران حیران سی دیکھ رہی ہو۔ خمیدہ لبوں پر پنک لپ اسٹک تھی اور لمبے ناخن بھی پنک نیل پالش سے پینٹ کیے گئے تھے۔ گردن لمبی اور پتلی تھی...... جیسے ایک راج ہنس غرور سے سر اٹھا کر دیکھ رہا ہو......اور لوکٹ گلے کی V کے اختتام پر ایک تل تھا۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی اور سفید سکرٹ اور سفید جوتوں کے درمیان پنڈلیوں پر نگاہیں پھسلتی جا رہی تھیں۔

وہ دلکش انداز سے گردن کو ایک طرف خم دیے باتیں کر رہی تھی۔ اس خم نے گردن میں ایک بڑا دلکش گڑھا پیدا کر دیا تھا۔ سر کی جنبش کے ساتھ ساتھ ایررنگ بھی ہچکولے کھا جاتے تھے۔ اس کی آواز بڑی شیریں تھی بڑی نمکین اور ریشمی سی آواز...... پھر

ایسا احساس ہوتا تھا گویا پیار سے کوئی جسم کو سہلا رہا ہو۔

ہم نے اس شام خوب باتیں کیں۔ میں نے اور ویلما نے زیادہ اور وقار نے کم۔ پھر وہ چلا گیا! وہ سمجھ دار تھا۔ کسی لڑکی کو ورثہ میں ملی ہوئی گائے نہ سمجھتا تھا۔ وہ میری دلچسپی کو بھانپ گیا تھا اس لیے کوئی بہانہ کر کے اُٹھ گیا۔ ہم نے اسے روکنے میں کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ بھی نہ کیا۔

شام کے سائے ڈھل گئے تو ہم اُٹھ کر اندر بار میں آ گئے۔ آتے ہی اس نے دو تین پیگ اکٹھے چڑھا لیے۔ اس کے بعد اس نے سگریٹ سلگایا اور کرسی پر پہلو بدل کر میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا پوچھتی ہو۔ ''بتا تیری رضا کیا ہے۔''

میں نے فلم کا ذکر کیا وہ فوراً مان گئی۔

ہال میں تاریکی ہوتے ہی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ نہ چھڑایا' وہ چھوٹا سا ہاتھ بڑا نرم تھا۔ میرے دبانے پر وہ اسپنج کی طرح دب گیا۔

''یونانی بوائے۔'' اس نے خود میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے بعد ہم نے خاموشی سے فلم دیکھی۔

واپسی پر اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ لمبی پلکوں نے قاتل آنکھوں کو ڈھانپ رکھا تھا اور نیم وا لبوں سے دو سفید دانت جھلک دکھا رہے تھے...... میری نگاہ تل تک جا پہنچی اور ہاتھ سٹیرنگ پر جیسے کانپنے لگے...... ''ویلما!'' میں نے آواز دی۔

وہ اسی طرح میرے کندھے پر سر رکھے کسمسائی مگر سر نہ اُٹھایا۔

''دیکھو ویلما! ہم یورپ میں نہیں...... مانا اس وقت سڑکیں سنسان ہیں پھر بھی اگر کسی سپاہی نے دیکھ لیا تو دھر لیے جائیں گے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''مجھے سگریٹ دو۔''

میں نے منہ والا سگریٹ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اب وہ ٹھیک ہو بیٹھی۔ اس نے خاموشی سے ایک دو کش لیے پھر سگریٹ اس کے ہونٹوں کے کونے میں دبا رہا اور وہ خاموشی سے ویران سڑک کو گھورنے لگی جو ہیڈ لائٹس میں ایک سرمئی فیتہ کی طرح کھلتی جا

رہی تھی۔اس نے سگریٹ باہر پھینکا اور ایک طویل سانس لینے کے بعد بولی۔''ڈارلنگ''

''ہوں''

ہماری آنکھیں ایک لمحہ کو چار ہوئیں۔اس کی آنکھوں کو پلکوں نے چھپا لیا۔وہ انگلی سے سکرٹ کی پلیٹ کو کُریدرہی تھی۔میں خاموش رہا۔بالآخر وہ بولی۔

''مجھے کچھ پیسے چاہئیں......اُدھار۔'' یہ کہہ کر اس نے سیٹ کی پشت پر ایسے سر ٹکا دیا جیسے اس نے بہت بڑا بوجھ اُتار دیا ہو۔میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا اس کی گود میں رکھ دیا۔اس نے کچھ نوٹ نکال کر اپنے پرس میں ڈال لیے اور بٹوا واپس میری جیب میں ڈال دیا۔میں نے اس کی طرف دیکھا وہ باہر دیکھ رہی تھی۔تھوڑی دیر کے بعد اس نے دو سگریٹ سُلگا کر ایک میرے ہونٹوں میں تھما دیا۔ہماری آنکھیں دوبارہ چار ہوئیں......وہ اچانک بولی۔

''مجھے یہاں اُتار دو۔''

''گھر نہ چلو گی؟''

''کس کے؟'' اس نے جیسے بے خیالی میں پوچھا۔

''اپنے گھر۔''

''نہیں' وہ آگے گلیوں میں ہے......بس میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' میں نے بریک لگائی۔وہ باہر نکل کر ایک لمحہ کو رُکی اور بولی۔

''تم بہت سویٹ ہو۔''

''تھینکس......سویٹ ہارٹ!''

اس نے مُڑ کر نہ دیکھا لیکن میں اسے دیکھتا رہا اور جب اسے ایک گلی کی تاریکی نے نِگل لیا اور ایک کتے نے مشکوک انداز سے بھونکنا شروع کیا تو میں نے کار دوبارہ سٹارٹ کر لی۔

گھر آ کر میں اس کے بارے میں سوچتا رہا اور کافی دیر تک اس کا وہ تل میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا......اور پھر میں سو گیا۔

''ارے کیا سو گئے؟''

وہ دونوں ڈانس سے فارغ ہوکر آ چکے تھے۔ ’’نہیں تو۔‘‘ میں نے چونک کر کہا۔

’’تو پھر یہ کیا اونگھ رہے ہو۔‘‘

مِس لوسی بے تحاشا ہنس دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اُکھڑی اُکھڑی لِپ اسٹک کے عقب سے پیلے مسوڑھوں نے جھانکا۔ میں نے ایک پیگ اور ختم کیا۔

’’ذرا باہر جاتا ہوں۔‘‘

مِس لوسی نے بازو پکڑا...... ’’ڈانس نہیں کرنا۔‘‘

’’ابھی نہیں!‘‘

’’جانے دو......‘‘ وقار بولا ’’ٹھنڈی ہوا کھا کر موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ میں دو قدم چلا تو اس نے آواز دے کر پوچھا۔

’’واپس آ ؤ گے نا‘‘

’’ہاں!‘‘

میں کلب سے باہر نکلا تو سڑک بلبوں کی زرد روشنی میں خاموش تھی۔ ٹھنڈی ہوا بڑا سکون دے رہی تھی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے میں چلتا گیا۔

...... مجھے ویلیما سے دوسری ملاقات یاد آ رہی تھی۔

تین چار دن کے بعد جب میں کلب آیا تو میں نے وقار سے اس کے بارے میں پوچھا۔

’’اس دن کے بعد میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔‘‘

’’بیمار نہ ہو گئی ہو۔‘‘

’’توقع تو نہیں...... وہ تو خود اچھی خاصی بیماری ہے...... تم اسے گھر لے گئے تھے؟‘‘

’’نہیں تو۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’ہم نے سینما دیکھا۔‘‘

’’اس کے بعد؟‘‘

''میں نے اسے اس کے گھر چھوڑ دیا۔''

''اس نے پیسے مانگے تھے؟''

میں نے جھوٹ بولا...... ''نہیں۔''

اس نے سگریٹ سُلگا لیا اور ایک کش لینے کے بعد اس نے میری طرف غور سے دیکھا ''شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے پھر ایک کش لیا اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''غالباً وہ بُری نہیں! سُنو! اس کا باپ پاگل خانے میں ہے' ماں بیمار ہے۔ بیمار اس لحاظ سے کہ اگر اسے روز شراب نہ ملے تو وہ پاگل پن کی حد تک جا پہنچتی ہے۔ ایک بھائی ہے جو پڑھتا کم ہے لیکن سکول کے نام پر پیسے زیادہ بٹورتا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو اب جوان ہے...... گھر میں کوئی کمانے والا نہیں......'' اس نے دوبارہ سگریٹ اٹھا کر ایک طویل کش لیا اور ناک میں سے دھوئیں کی دھاریں چھوڑتا ہوا دوبارہ بولا ''غالباً وہ بُری نہیں۔''

......ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔

''میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''کیا کرو گے؟''

''شاید وہ بیمار ہو۔''

''تمہیں وہ گھر نہیں لے گئی تھی؟''

''نہیں! میں نے اسے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔''

''ہوں!''...... اس نے مجھے پتہ سمجھا دیا اور میں نے فوراً اس کے گھر کا رُخ کیا۔

وہ ایک عام سا فلیٹ تھا۔ بیل کے جواب میں ایک لڑکی نے آ کر دروازہ کھولا۔ پتلے دُبلے جسم پر ایک میلا سا فراک جھول رہا تھا...... رنگ سفید تھا۔ بیضوی چہرے پر سیاہ بھووں کے نیچے اس کی لمبی آنکھیں مجھے تجسس سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور پنڈلیوں پر بالوں کا سُرمئی غبار تھا۔ میں نے ویلما کا پوچھا۔ اس نے جواب دیئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ یہ اندر آنے کی دعوت تھی جسے میں نے قبول کر لیا' وہ مڑی اور میرے آگے آگے اس کی پونی ٹیل جھول رہی تھی۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ کھڑکیوں پر میلے سے پردے لٹک

رہے تھے۔ ایک طرف خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کی تصویریں تھیں اور نیچے مینٹل پیس پر ایک پُرانا ٹائم پیس تھا۔ اِدھر اُدھر کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ دو پلنگ تھے جن پر بستروں کا ڈھیر تھا۔ اس ڈھیر پر ایک بوڑھیا بیٹھی تھی۔ کھچڑی بال اور چہرہ پر کئی طرح کے داغ تھے۔ اس نے اپنی سُرخ اور گول آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اس کے بعد وہ ٹانگ ہلانے کے اہم کام میں مشغول ہوگئی۔ سُوتی جرابیں گھٹنوں تک جاتی تھیں۔ شوخ رنگ کا میلا سا فراک ویلما کا ہوگا۔ اس کمرے کی سب سے صاف ستھری اور معقول چیز ایک ریڈیو تھا جو فُل والیوم پر چل رہا تھا۔ کوئی انگریزی گیت تھا۔

اگلے کمرے میں ویلما بستر پر لیٹی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران سی کھڑی ہوگئی۔

''تم؟'' اسے جیسے اپنی آنکھوں پر اعتماد نہ تھا۔ ''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔''

''اوہ۔'' وہ شرمندہ سی ہوکر بولی۔ ''دراصل مجھے اتنا تعجب ہوا ہے کہ......'' میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا وہ میرے سامنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے مردانہ سلیپنگ سُوٹ پہن رکھا تھا۔ گہری نیلی اور سُرخ دھاریوں والی بُش شرٹ میں اس کا سانولا چہرہ دمک رہا تھا۔ میک اپ نہ ہونے کی وجہ سے چہرہ کا نمک جیسے اور بھی نکھر گیا تھا۔ بُش شرٹ کے دو بٹن کھلے تھے جنہیں اس نے فوراً بند کردیا۔

اس کی بہن کھڑی تھی۔ ''یہ ایستھر ہے۔'' اس نے ہمارا تعارف کرایا اور وہ پونی ٹیل ہلاتی باہر چلی گئی۔

''میرا خیال تھا تم بیمار نہ ہو۔''

''میری طبیعت خراب تھی۔''

ہم دونوں خاموش ہوگئے۔ وہ ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکائے بیٹھی تھی تھوڑی دیر بعد اس نے ایک سگریٹ سلگایا...... ''چائے پیو گے؟''

''نہیں۔''

''کافی؟''

''پی لوں گا۔''

اس نے ایستھر کو آواز دے کر کافی بنانے کے لیے کہا اور خود تکیہ کے نیچے سے

ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔

''یہ کیا ہے؟''

''اُس رات میں نے تم سے لیے تھا نا؟''

میں نے روپے پکڑنے کو ہاتھ نہ بڑھایا۔ وہ اُٹھ کر میری کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ اس کے جسم کی مہک خوشگوار تھی۔

''میں نے اُدھار مانگا تھا'' میں نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نہیں لوں گا۔''

''یُو سِلی!......'' اس نے میری جیب میں سے بٹوا نکال لیا اور اس میں نوٹ ڈال کر دوبارہ وہاں رکھ دیا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''ہوں!'' وہ بولی۔

''یہ میرے نوٹ ہیں؟''

وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش رہی ''ہاں۔''

''تم نے انہیں خرچ کیوں نہ کرلیا اگر واپس کرنے ہی تھے تو بعد میں اپنی سہولت سے واپس کیے جاسکتے تھے۔''

''میں نہیں جانتی......لیکن ضرورت کے باوجود بھی میں انہیں خرچ نہ کرسکی۔'' وہ اُٹھنے لگی لیکن میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''کیوں ویلما' کیوں؟''

اس نے ایک لمبی سانس لی...... ''میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

اس نے میرے ہاتھ سے جلتا ہوا سگریٹ لے کر ایک کش لگایا اور پھر اسے فرش پر پھینک دیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بڑھا اور اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کررہی تھی۔ مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہورہا تھا۔

''ویل''......مگر اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے انگلیوں کو چوم لیا اس نے ہاتھ وہاں سے ہٹا لیا۔

"تم خاموش رہو۔" اس کی آواز میں ایک نیا بوجھل پن پیدا ہوگیا تھا۔ اس میں لرزش تھی جیسے ہوا سے دیپک کی لو تھرتھرا رہی ہو۔ "میری طبیعت خراب نہ تھی۔ میں پریشان تھی۔ اس عرصہ میں میں نے پہلی بار اپنے بارے میں سوچا..... نہایت دکھ اور سنجیدگی کے ساتھ"..... اس نے میرے سر کو اپنی گود میں اور بھی دبا لیا اور بالوں سے کھیلنے والے ہاتھ نے اب گالوں کو تھپتھپانا شروع کر دیا۔ وہ ایک لمحہ کو خاموش رہی..... "مجھے تم سے محبت ہے۔" اس نے اچانک ہی کہہ دیا۔ "بلومت..... اور کچھ نہ بولو..... پلیز!" اس نے میرے سر کو اور بھی دبا لیا تھا۔ اب وہ پھر بالوں سے کھیل رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کہ وقار نے تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہوگا..... میں واقعی بہت بری ہوں..... کیا میں تم سے محبت کر سکتی ہوں؟" اس نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر میرے منہ کو اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں میرے نقوش کو ایک اندھے کی انگلیوں کی طرح ٹٹول رہی تھیں۔ سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وادیوں میں گھٹاؤں نے برسنا شروع کر دیا تھا وہ اچانک اٹھی اور سامنے پلنگ پر تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔

"ویلما" میں نے اس کے لرزتے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کیسے چپ کراؤں۔ "ویلما پلیز!" میں اس کے بالوں کو سہلاتا رہا اور آہستہ آہستہ وہ خاموش ہوگئی مگر اس نے تکیہ سے سر نہ ہٹایا۔

ایستھر کافی لائی اور میز پر رکھ دی..... اس نے اپنی بہن کی طرف نہ دیکھا۔ بس میری طرف خالی نظروں سے دیکھا اور خاموشی سے چلی گئی۔ ساتھ کے کمرہ کا ریڈیو بند ہوگیا تھا اور کمرہ بڑا خاموش تھا۔ میں نے کافی بنائی اور اسے اٹھایا۔ اس نے کافی پینے سے انکار کر دیا اور میری گود میں اپنا سر ڈال دیا۔ میں اس کے بالوں سے کھیلتا رہا اس نے چہرہ اونچا کر کے بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے لب کپکپائے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر اس نے نچلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا۔ میں نے اسے چومنے کو منہ جھکایا مگر اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "نو" اور اٹھ کر کافی کا کپ اٹھا لیا۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ ساتھ کے کمرے میں اس کی ماں ایستھر سے تیز لہجہ میں کچھ کہہ رہی تھی جس کے جواب میں ایستھر نے چپ سادھ رکھی تھی۔ ویلما نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کپ کے کنارے پر

ٹکے تھے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کے سامنے کافی کے دھوئیں کی باریک لکیروں نے آڑے ترچھے جال سے بُن رکھے تھے۔

.... یہ تھی ہماری دوسری ملاقات

اس کے بعد تو جیسے وہ میرے ذہن پر سوار ہوگئی۔ ہم عموماً اکٹھے ہی گھومتے مگر اس نے نہ تو مجھے کِس کرنے دیا اور نہ ہی مجھے کوئی پیسہ خرچ کرنے دیا۔ جب ایک مرتبہ میں نے احتجاج کیا تو وہ کہنے لگی۔ ''ساری دنیا مجھ پر پیسہ خرچ کرتی ہے اگر میں نے تم پر خرچ کر دیا تو تمہارا اس میں کیا بگڑتا ہے۔''

''مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں، میں تمہیں چاہتی ہوں اور تم پر کچھ خرچ کرنے سے اگر مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے تو تم اسے کیوں مجھ سے چھینتے ہو'' اور میں خاموش ہو رہا۔ وہ مجھے اپنی گھریلو باتیں، بچپن کے واقعات اور سہیلیوں کے رومانس سب کچھ بتایا کرتی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

''تم شادی کیوں نہیں کرتیں؟''

اس نے بڑی بڑی آنکھوں کو جھپکا کر میری طرف دیکھا اور خاموش رہی۔ ''تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''شی!......ایسے سوالات نہیں پوچھا کرتے۔''

''پھر بھی!''

''تمہارا اندازہ کیا ہے۔''

''میرے خیال میں بیس اور پینتیس کے درمیان۔''

وہ ہنس دی......پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی...... ''مجھ سے شادی کون کرے گا''

''میں۔''

''یُو سِلی!'' اس نے مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''تم بعض اوقات بچوں جیسی بات کرتے ہو۔''

مجھے بہت بُرا لگا...... ''اب موڈ آف مت کرو'' ......وہ بولی۔ ''اگر میں شادی کر

لوں تو ان سب کا کیا بنے گا۔''

''دیکھو! میں تمہیں سمجھتا ہوں' تمہارا کنبہ میرا ہوگا۔ میرے پاس کافی پیسہ ہے اور ہم سب اطمینان سے گزارہ کر سکتے ہیں۔''

''نہیں۔''

''مگر کیوں......''

اس نے پھر بچوں کی طرح میرے گال کو تھپتھپانا شروع کر دیا۔ ''بعض باتیں ایسی ہیں جنہیں تم ابھی نہیں سمجھ سکتے لیکن ایک وقت آئے گا جب تم میرا ذکر محبت اور عزت سے کرو گے!'' وہ ایک لمحہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ میرے گالوں پر اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ''مجھے زندگی میں دو چیزوں کی تمنا ہے۔ محبت' وہ مجھے تم سے مل گئی اور عزت' جو مجھے کبھی نہ مل سکے گی۔''

''مگر میں تو......''

''میں جانتی ہوں...... میں جانتی ہوں۔'' وہ خاموش ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''تم کہتی ہو تمہیں عزت کبھی نہ مل سکی لیکن تم بھولتی ہو کہ عزت داخلی چیز ہے۔ اگر تم اپنی عزت کر سکتی ہو تو تمہیں دنیا والوں کی زبان کا خیال نہ کرنا چاہیئے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے اس میں تمہاری اپنی مرضی کو دخل نہ تھا۔ تم اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو عزت کی دوکان پر بیچ رہی ہو۔ یہ دوسروں کے نزدیک تو بے عزتی کی بات ہو سکتی ہے مگر میرے نزدیک ایسا نہیں...... اور اسی لیے میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ بولو! کیا تمہارے دل میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ تمہارا اپنا گھر ہو جس میں ہر چیز تمہاری پسند اور ذوق کی آئینہ دار ہو۔ تمہارے اپنے بچے ہوں پیارے پیارے...... شور مچاتے...... اور تمہارے پیچھے امی امی کرتے بھاگتے ہوئے بچے...... کیا تم......''

وہ ایک دم چیخ پڑی۔ ''اوہ! فار کرائسٹ سیک!! چپ ہو جاؤ...... چپ ہو جاؤ!!''

اس کی آواز آنسوؤں کی دھار میں ڈوب گئی۔ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ کر سسک سسک کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے پیار سے اس کے گالوں کو سہلایا۔ ''ویلما! مجھے تمہارے احساسات کا اندازہ ہے اور میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ میرا مقصد تمہارے جذبات کو ٹھیس

پہنچانا نہ تھا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور میں اپنی محبت کا عملی ثبوت دینا چاہتا ہوں۔''

مگر وہ کچھ نہ بولی۔ آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گالوں پر آ آ کر ٹوٹ رہی تھیں۔ میں نے اسے چُپ نہ کرایا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموش ہوگئی اور پھر کہنے لگی۔ ''تم سے شادی نہ کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو میں یہ نہیں چاہتی کہ تم میرے تمام کنبہ کا بوجھ سنبھالو۔ بات نہ کاٹو...... اور دوسری وجہ یہ...... کہ مجھے ٹی بی ہے۔''

''مگر ٹی بی کا تو علاج کرایا جاسکتا ہے۔''

''نہیں! میں علاج نہیں چاہتی...... میں مرجانا چاہتی ہوں۔''

''ویلما۔''

''ہاں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا مگر اس نے آنکھیں جھکالیں۔ گالوں پر آنسوؤں کی خشک لکیر کے نشانات موجود تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ ''کیوں؟...... ویلما کیوں؟؟'' وہ خاموش رہی۔

...... دُور سے کسی کار کی تیز روشنی نے مجھے اپنے گردوپیش کا احساس کرایا۔ میں سڑک پر کافی آگے نکل آیا تھا سوچا واپس جاؤں لیکن پھر کلب کا گرم ماحول یاد آ گیا۔ باہر سڑک پر کافی سکون تھا' میں نے ایک اور سگریٹ سُلگایا اور نالے کے چھوٹے سے پُل پر چڑھ بیٹھا۔ سگریٹ نے اس وقت بڑا سکون دیا۔ دماغ میں جو بحرانی کیفیت تھی وہ ٹھنڈی ہوا سے ایک حد تک کم ہوگئی تھی۔

مجھے اور باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ایستھر کرذکر بڑے پیار سے کرتی تھی۔ اس نے بتایا کہ جب ایستھر چھوٹی سی تھی تو امی سخت بیمار ہوگئی چنانچہ اس وقت ایستھر راتوں کو میرے ساتھ سوتی تھی اور کئی ماہ تک میں اس کے لیے بہ یک وقت ماں' انا اور نرس کا کام کرتی رہی۔

ایستھر کو ویلما سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ میرے خیال میں اسے ویلما سے اچھی خاصی نفرت تھی۔ اس نے ویلما کے ملاقاتیوں میں سے کبھی بھی کسی کے ساتھ ہنس کر بات نہ کی تھی۔ وہ بڑی خاموش اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ شروع شروع میں اس نے میرے ساتھ بھی دیگر ملاقاتیوں ایسا سلوک روا رکھا لیکن جب اسے احساس ہوگیا کہ مجھ میں اور دیگر ملاقاتیوں

میں فرق ہے تو اس کے رویہ میں تبدیلی آ گئی۔ اسے مطالعہ کا بڑا شوق اور مذہب کا جنون تھا۔ جب وہ کسی نئی کتاب کا ذکر کرتی تو اس کی آنکھوں میں وفورِ شوق سے ایک نئی چمک پیدا ہو جاتی۔ وہ مجھ سے بھی ادھر اُدھر کے سوالات پوچھتی رہتی۔ ایک دفعہ کہنے لگی۔ ''نیو بولا سے سورج کیسے بن جاتا ہے۔''

میں چکرا گیا۔ ''مگر یہ نیو بولا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ وہ ہنس دی۔ ''واہ! اتنے بڑے ہو گئے اور ابھی تک اس کا پتہ نہیں۔''

ایک دن بیٹھے بیٹھے پوچھ بیٹھی۔ ''فیدم کتنے فٹ کا ہوتا ہے؟''

ایستھر کی میز پر کتابوں کا ڈھیر پڑا رہتا تھا۔ پلنگ کے سرہانے کنواری مریم کی تصویر تھی اور اس کے گلے میں مقدس صلیب جھولتی تھی۔ وہ ہر رات دعا مانگ کر سوتی تھی۔ سارے کنبے میں صرف وہی باقاعدگی سے چرچ جاتی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم کیا دعا مانگا کرتی ہو۔'' پہلے تو وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔ ''میں ویلما کے لیے دُعا مانگتی ہوں...... کاش مقدس ماں اسے صحیح روشنی دکھائے۔''

''تو تمہارے خیال میں وہ......''

''ہاں وہ ٹھیک راستہ پر نہیں جا رہی۔ وہ خود کو تو خراب کر رہی ہے لیکن ہم لوگوں کے حق میں بھی کانٹے بو رہی ہے۔''

''کانٹے بو رہی ہے......؟''

''اور کیا! ہماری یہاں تھوڑی بدنامی ہو چکی ہے' ویلما کا نام لے لے کر میرا مذاق اڑایا جاتا ہے۔''

''تم جانتی ہو اسے تم سے کتنی محبت ہے۔''

''وہ کسی سے محبت نہیں کرتی...... وہ خود پرست اور خود سر ہے۔ وہ کسی سے محبت کر ہی نہیں کر سکتی......'' وہ خاموش ہو گئی پھر کہنے لگی۔ ''وہ میری بہن ہے' کسی وقت وہ میرا آئیڈیل تھی مگر اب...... اب میں اس کے چہرے کو نظر بھر کے بھی نہیں دیکھ سکتی...... میں صرف اس کے لیے دُعا کر سکتی ہوں۔ خداوند یسوع مسیح اسے سچائی کے راستہ پر چلنے کی توفیق دیں۔ ایک دفعہ وہ بہت پریشان تھی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ دُعا مانگے اس سے بڑا

سکون ملے گا اور پتہ ہے اس نے کیا کہا...... کہنے لگی مجھے دعا پر اعتماد نہیں تھا! اگر دعا پر اعتماد نہیں، خدا پر اعتماد نہیں...... تو پھر کس پر اعتماد ہے۔ کیا صرف پیسہ اور وسکی کی بوتل ہی اعتماد کے قابل ہیں۔"

ویلما سے ایستھر کی نفرت پوشیدہ نہ تھی وہ جانتی تھی لیکن اس کے باوجود چاہتی تھی کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے تاکہ وہ خود مختار ہو سکے اور شاید اسی لیے وہ اب تک ٹی بی سے جنگ کر رہی تھی۔ اس کی بیماری کا گھر میں کسی کو پتہ نہ تھا......

مجھے کچھ مدت کے لیے باہر جانا پڑا۔ میں نے ویلما کو کئی خطوط لکھے مگر اس نے جواب نہ دیا۔ مجھے جواب کی توقع بھی نہ تھی کیونکہ بوقتِ رخصت جب میں نے خط لکھنے کے لیے کہا۔ تو وہ بولی...... "کوئی فائدہ نہیں! تمہارے آنے تک میں سینی ٹوریم میں پہنچ چکی ہوں گی اور ہو سکتا ہے میں ختم ہی ہو جاؤں۔ اس لیے میری حالت پڑھ کر بیکار پریشان ہونے کا کیا فائدہ ہو گا۔" اس نے اپنی ایک تصویر دی جس کی پشت پر اس نے یہ شعر لکھا:

To be loved, All I need

To whom! I love, I love Indeed.

جب اس نے اپنے کہنے کے مطابق کئی خطوں کا جواب نہ دیا تو میں نے بھی خط لکھنے بند کر دیئے۔ کبھی کبھی وہاں جی اداس ہوتا تو اس کی تصویر نکال کر دیکھ لیتا۔ مسکراتے لب اور مسکراتی آنکھیں...... کاش! اس کا دل بھی اسی طرح مسکرا سکتا...... کاش میں اس کی جھولی مسرتوں سے بھر سکتا۔ اے کاش! اس کے ہونٹوں پر تبسم کی کرنیں سدا رقصاں رہتیں۔

مجھے اندازہ سے زیادہ دیر ہو گئی اور کئی ماہ کے بعد جب میں واپس آیا تو پہلی فرصت ہی میں ان کے گھر کا رخ کیا۔ میرے اندیشے درست نکلے۔ وہ سینی ٹوریم جا چکی تھی۔ کمرہ پہلے سے بھی زیادہ ناگوار تھا۔ کھونٹیوں پر اس کی سٹاکنگ کا ایک جوڑا گرد کھا رہا تھا۔ پردے پہلے سے بھی زیادہ میلے تھے۔ گھر میں کوئی نہ تھا صرف ایستھر تھی۔ ہمارے درمیان خاموشی کی ایک خندق تھی جسے پھلانگتے ڈر سا لگتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایک لمبی سانس لے کر میری طرف ویران سی نظروں سے دیکھتی اور پھر سر جھکا لیتی۔ میری نگاہوں کے سامنے ڈریسنگ ٹیبل تھی جس پر اب بھی روغن کا ایک ڈبہ پڑا تھا۔ میں نے پوچھنا چاہا مگر

دماغ بالکل خالی تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہ آ تا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ وہ اچانک بولی۔ ''ان کی بیماری کے بعد ان کے ملنے والوں میں سے ایک نے بھی آ کر نہیں جھانکا۔ جو لوگ ہر وقت انہیں گھیرے رہتے تھے اب ان میں سے اگر کوئی بازار میں ملتا ہے تو ایسی اجنبی اجنبی نظروں سے دیکھتا ہے کہ بس جان ہی تو جل جاتی ہے۔ ... میں نے ادھر اُدھر ملازمت تلاش کی مگر کہیں کچھ بات نہ بن سکی... حالت بہت خراب ہے۔''

میں نے جب اسے کچھ نوٹ نکال کر دیئے تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو! اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے دبا لیا... اتنا دبایا کہ ان میں سے خون نکل آیا... مگر وہ آنسو نہ روک سکی۔

مجھے دیکھ کر ویلما کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ وہ مسکرائی اس کے خشک ہونٹ پھڑا کر رہ گئے تھے۔ گالوں کی ہڈیاں اُبھر گئی تھیں اور ان کے نیچے گڑھے تھے۔ خشک اور رُوکھے بالوں کے درمیان تکیہ پر اس کا سر سوکھی بیلوں پر ایک مُرجھایا ہوا پھول لگ رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک البتہ ویسی ہی تھی۔ سیاہ حلقوں کے درمیان اب بھی ان آنکھوں کے تاروں کی تابانی ویسی ہی تھی۔ اس کے پاس اپنے ماضی کی نشانی کے طور پر صرف یہی چمک ہی تو رہ گئی تھی... میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر وہ دوبارہ مسکرائی۔ میں اس کے لیے پھول لایا تھا۔ اس نے آج تک مجھے کبھی کوئی تحفہ دینے کی اجازت نہ دی تھی۔ اس کے لئے پھولوں کا یہ گلدستہ پہلا تحفہ تھا جو میں اس کی اجازت کے بغیر لے کر آیا تھا۔ اس نے انہیں چوما اور اپنے گالوں کے ساتھ لگا لیا۔

وہ بھی تو ایک... پھول ہی تھی... نرگس بیمار! کبھی وہ چنبیلی کی مانند بے داغ ہو گی لیکن پھر تو وہ کاغذی پھول بن گئی۔ جس میں خوشبو نہیں' بلکہ چمک دمک ہو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں۔

... میرا سگریٹ ختم ہو گیا تھا۔ ذہن میں تلخ یادوں کا الاؤ بجھ کر اب راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں اُٹھا اور واپس کلب چل دیا۔ وہ دونوں ناچ رہے تھے۔ میں ان کی میز پر آ کر بے دلی سے بیٹھ گیا۔ ایک پیگ بنا کر پیا اور رقصاں جوڑوں کو دیکھنا شروع کیا اور پھر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔

''ایستھر'' میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ہاں وہ ایستھر ہی تھی۔ پونی ٹیل غائب تھی۔ پرم کیے ہوئے بالوں نے اس کے بیضوی چہرہ کے خطوط کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا' اس کا پارٹنر ویلما کے خاص قدر دانوں میں سے تھا۔ وہ بدصورت تھا اور اُدھیڑ عمر تھا اس کی بیوی اس سے طلاق لے چکی تھی مگر اس کے پاس نئی شیورلٹ اور بینک بیلنس تھا۔

ایستھر نے بہت احتیاط سے میک اپ کیا تھا۔ پتلی کمر ساتھی کے بوجھ سے جیسے کنول کے ڈنٹھل کی مانند دبی جا رہی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ وہ بھی ہنس رہا تھا اور اس کے پیلے پیلے دانتوں میں سونے کا ایک دانت روشنی میں زیادہ نمایاں ہو رہا تھا۔

میری نظریں گھڑی کی طرف اُٹھ گئیں' بارہ بجنے والے تھے...... اوہ! زیرو اوور! چند ثانیوں میں نیا سال جنم لینے والا تھا۔ تمام جوڑے رقص میں مصروف تھے۔ آرکسٹرا کی دُھن وجد انگیز تھی' صرف میں ہی میز پر تنہا بیٹھا تھا ورنہ باقی سب میزیں خالی تھیں۔ شام سے مصروف بیرے بھی اب ڈانس کرنے والوں کو دیکھ رہے تھے۔

اور پھر ہال میں تاریکی چھا گئی! میں نے گلاس منہ سے لگا لیا۔ ہال میں سیٹیوں اور عورتوں کی دبی دبی ہنسی اور قہقہے گونج رہے تھے۔ پھر ہال جگمگا اٹھا اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے لوگوں کے ہجوم میں جو چند جوڑے ابھی تک ہونٹوں پر ہونٹ رکھے مست کھڑے تھے ان میں ایستھر اور اس کا ساتھی بھی تھا۔

○.....○.....○

کانا چور

خوش قسمتی کے کئی رُوپ ہیں۔ کسی کو یہ چاندی کے چمچے کی صورت میں پیدائشی طور پر ملتی ہے تو کسی کو راہ چلتے میں گاہک کی طرح۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان خوش قسمتی کی کئی قسمیں، صورتیں اور انداز ملتے ہیں۔ خاور کو خوش قسمتی ایک مکروہ صورت بوڑھے کے رُوپ میں ملی تھی۔ شاید اسے مکروہ صورت بوڑھا کہنا قدرے مبالغہ ہو۔ مثلاً بعض کے لیے وہ مکروہ صورت نہ ہو جیسے اس کی سیکرٹری جسے وہ مقررہ تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً تحائف بھی دیتا رہتا تھا۔ اسی طرح اس کا بوڑھا ہونا بھی خاصہ مشکوک تھا۔ یہ دُرست ہے کہ وہ پچاس سے کم نہ ہوگا، سر کے بال بھی غائب تھے۔ غائب کیا درمیان مین چٹیل میدان تھا جس کے کناروں پر اُگے بال سبزہ بیگانہ کی مانند تھے لیکن ہر عورت جانتی ہے کہ بڑھاپے کا عمر یا بالوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کی گواہی وہ تمام عورتیں دے سکتی تھیں جنہیں کسی نہ کسی طور بیگ صاحب کی کسوٹی بننے کا موقع ملا تھا اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ بیگ انٹر پرائز کے مینجنگ ڈائریکٹر لاکھوں کی اسامی تھے اور لاکھوں کی تعداد کا صرف اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سال انہوں نے ہیرا پھیری سے کوئی ڈیڑھ پونے دو لاکھ کا تو ٹیکس ہی بچایا تھا۔ اب اگر چہرہ سیاہ ہو اور اس پر برص کے داغوں نے منہ تک اپنا نقشہ پھیلا رکھا ہو تو اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے اور واقعی بیگ صاحب کو آج تک کسی طرح کا فرق پڑا بھی نہ تھا۔ جس طرح ہندوستان کے نقشہ کے نیچے لنکا ایک آنسو کی طرح لٹکا محسوس ہوتا ہے اسی طرح ان کے سر آنکھوں اور گالوں پر پھیلے نقشے کے نیچے اور عین ہونٹوں پر برص نے

جیسے ایک آنسو ٹپکا دیا تھا جس سے منہ کھول کر بات کرنے پر ان کے کھلتے اور بند ہوتے ہونٹ دیکھ کر کراہت کا احساس ہوتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید احساس کمتری کا شکار ہوتا لیکن وسیع کاروبار' بینک بیلنس اور اس سے لوگوں کو خریدنے کی استطاعت نے ان میں ہر طرح کا احساس ختم کر دیا تھا۔ بھلا معمولی سے احساسِ کمتری کی کیا حیثیت تھی۔

بیگ صاحب کے کئی کاروبار تھے جن میں سے ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی تھی۔ ذاتی طور پر انہیں اس کام کا تجربہ نہ تھا بلکہ امپورٹ اور ایکسپورٹ کے مقابلہ میں نفع بہت کم تھا۔ اگر ساری دردسر کے بعد سال میں ساٹھ ستر ہزار یا چلو لاکھ کا بھی نفع ہو گیا تو ان کے معیار کے لحاظ سے یہ کچھ بھی نہ تھا البتہ فرنج بینیفیٹس میں جو کچھ شامل تھا وہ بطورِ نقدی نہیں بلکہ بصورتِ جنس تھا۔ جن طرح دار لڑکیوں کے چہرے اور کمریں لاکھوں کی اشیاء فروخت کرتی تھیں وہ ان کے سامنے بچھ جاتیں اور جب سے ان کی ایک دو ماڈلوں کو فلموں میں رول ملے تھے اس وقت سے تو ان کی کمپنی کی شہرت اور بھی پھیل گئی تھی اور کمپنی کی شہرت کے ساتھ بیگ صاحب کی بھی' مختلف لڑکیوں نے اچھے بُرے اور تعریفی یا نفرت و کراہت اور پھر غصہ و خشونت سے ان کے جس طرح تذکرے کیے تھے انہوں نے مخصوص حلقوں میں ان کی شہرت پھیلا دی تھی۔ ویسے ان کے بے تکلف دوست تو انہیں ہمیشہ ہی سے ''سٹڈ'' کہتے چلے آئے تھے۔

ان کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازم ہونے کی بنا پر خاور بیگ صاحب کے زریں کارناموں سے واقف تھا۔ اس لیے اب وہ ان کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس شخص میں دولت کے علاوہ اور بھی کوئی خصوصیت ہے۔ بظاہر تو وہ ایسی چارکول پینٹنگ تھا جسے آرٹسٹ ڈھنگ سے نہ بنا پایا تو جھنجلاہٹ میں اس پر سُرخ رنگ اُلٹ دیا۔

''ہوں۔'' وہ بڑے انہماک سے تصویر دیکھ رہے تھے اور وہ ان کے چہرے کو۔

''بہت خوب''

''سر! تو پھر یہ آئیڈیا پسند آ گیا آپ کو۔''

''آئیڈیا؟'' وہ جیسے چونک کر بولے۔ ''میں نے تو آئیڈیا پر غور نہیں کیا۔''

''سر؟''

''ہاں بھئی! میں تو ماڈل کو دیکھ رہا تھا۔''

خاور کو دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

''واہ! کمر اور کولہے...... واہ وا۔ کمر چوبیس سے زیادہ نہ ہوگی۔''

خاور کی سانسیں تیز سے تیز تر ہو رہی تھیں۔

''مائی گاڈ! ایسی عورت تو مرد کو چوتھے آسمان پر پہنچا دے......''

خاور کا حلق جیسے سُوکھ گیا تھا۔

''پتہ نہیں کون خوش قسمت لوگ ہیں جنہیں خدا ایسی عورتوں سے نوازتا ہے۔ مائی گاڈ 42......24......42۔Perfect figure''

خاور کے اعصاب تنے ہوئے تاروں کی طرح تھے۔

''مائی گاڈ! مجھے اگر یہ مل جائے تو میں۔ میں......'' بیگ صاحب اس سے جو حُسنِ سلوک کرنا چاہتے تھے اس کی وضاحت کے لیے کوئی موزوں لفظ نہ پا کر انہوں نے تصویر پر سے گردن اٹھائی تو خاور کی آنکھوں میں عجیب کیفیت دیکھی یہ غصہ کی چمک تھی یا دیوانگی کی۔ بیگ صاحب نے غور سے آنکھوں میں دیکھا تو ان دونوں ہی کا امتزاج نظر آیا پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہتے خاور نے ان کے ہاتھ سے تصویر جھپٹی اور تقریباً چیخ کر بولا۔

''بیگ صاحب یہ میری بیوی ہے۔''

دھڑ سے دروازہ بند ہو جانے کے بعد بھی بیگ صاحب کا منہ کُھلا کا کُھلا رہا۔ پھر انہوں نے منہ بند کیا۔ پھر ہونٹوں پر مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر ہنسے تو بے حد سفید (مگر نقلی) دانت چمک اُٹھے اور اس کے بعد حلق سے فوارہ کی طرح قہقہے اُبل رہے تھے۔

"My God what a fantastic sitution-- My God!!"

(2)

''چائے پیو گے؟''

''میں نہیں پیتا۔''

''اوہو! کیا بات ہے۔''

''کچھ نہیں۔''

''تو پھر یہ منہ سجائے کیوں بیٹھے ہو۔''

وہ خاموشی سے پیٹھ موڑے بیٹھا رہا۔ آج ضرور دفتر میں کوئی بات ہوئی ہے۔ کیونکہ ایک تو وہ جلدی گھر آ گیا تھا اور جب سے آیا تھا یوں ہی تنا بیٹھا تھا یا تو کسی سے لڑ کر آیا تھا ورنہ اس سے لڑنے کو تیار تھا۔ اس نے سوچا کیا میں نے کوئی ایسی حرکت کی ہے۔ مگر مطمئن تھی کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ رات بھی ٹھیک ٹھاک گزری تھی' صبح بھی ٹھیک تھا مگر اب کیا ہو گیا اسے؟ وہ اس کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گئی' خاور کے جسم میں لرزش کی لہر دوڑ گئی مگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔

''اے جی۔'' وہ کھنکار کر بولی۔ ''یہ کیا بوریت پھیلا رکھی ہے۔''

وہ پیچھے سے اسے لپٹ گئی اور خاور کا تنا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے بھی اسے محسوس کیا اور بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا۔

''مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں۔''

''میری کوئی بات بُری لگی؟''

''نہیں تو۔''

''تو پھر کیا ہوا ہے؟''

وہ اُٹھ کر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ ''اب بولو! کیا بات ہے۔''

''وہ......وہ......'' اس کے مُنہ سے الفاظ نہ نکل رہے تھے ''وہ حرامزادہ''

''کون؟''

''وہ۔ وہ تمہاری تعریف کر رہا تھا۔''

''کون تعریف کر رہا تھا۔''

''وہ......وہ کہتا تھا تمہاری چھاتیاں......تمہاری......''

ایک دم اس کا ہاتھ حفاظتی انداز میں اپنی چھاتیوں پر آ گیا مگر کچھ نہ بولی۔ خاور خاموش ہو گیا پھر ایک طویل سانس لے کر قدرے پُرسکون لہجہ میں کہنے لگا۔

''میں آج بیگ صاحب کے پاس صابن کے اشتہار کی تصویر لے کر گیا تھا۔''

''میری تصویر؟''

''ہاں۔''

''اوہ!''

''اس نے تمہاری تصویر بہت پسند کی۔''

''تو اس میں گرمی کی کیا بات ہے؟''

''تم سمجھتی نہیں، اگر وہ عام طریقہ پر تمہاری خوبصورتی کی تعریف کرتا تو ٹھیک تھا مگر اس نے تو۔ اس نے تو......'' وہ جھجک کر خاموش ہوگیا اور وہ سُرخ چہرہ لئے جیسے منصفین کے فیصلہ کی منتظر تھی۔

''کہنے لگا...... کہنے لگا۔''

''ہاں ہاں کہو۔''

''بھئی بڑی وَلگر باتیں اس نے کیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا۔''

''میں نے اسے بتایا کہ یہ تصویر میری بیوی کی ہے لیکن میں اس قدر غصہ میں تھا کہ وہاں بیٹھ نہ سکا۔''

''تم سدا کے احمق ہو۔''

''کیا مطلب؟'' وہ بپھر کر بولا۔ ''اس حرامزادے کو تمہارے Vital Statistics کی پیمائش کرنے دیتا؟''

''یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔''

''تو پھر؟''

''تم خاموش رہتے۔''

''میں اتنا بھی بے غیرت نہیں ہوں کہ وہ میری بیوی کی چھاتیوں اور کولھوں کا قصیدہ پڑھتا اور میں سُن کر بیٹھا مکرر ارشاد فرمایئے کہتا رہتا۔''

''اوہو! تم تو یوں ہی بھنائے جاتے ہو۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔''

''تو پھر کیا مطلب تھا۔''

''بات سنو تو مطلب سمجھو۔''

''کہو۔''

''تم ایک بات بھول گئے ہو کہ وہ تمہاری بیوی کی نہیں ایک ماڈل کی تعریف کر رہا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''کیا مطلب؟'' وہ اس کی نقل اُتارتے ہوئے بولی۔ ''اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے؟ اسے کیا پتہ کہ یہ تصویر کس عورت کی ہے۔ تمہاری بیوی کی ہے کہ کانے چور کی بیوی کی...... اس نے تو تصویر کو پروفیشنل آنکھ سے دیکھا اور تعریف کر دی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے...... مگر تم میری بیوی ہو۔''

''پھر وہی بات؟ یہ تو تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں اسے کیا پتہ۔ اس کے لیے تو محض ماڈل تھی۔ ایک غیر عورت بلکہ ایک پروفیشنل عورت۔''

''ہوں۔''

''لہٰذا بے عزتی اس وقت ہوئی جب تم نے اسے یہ بتایا کہ میں تمہاری بیوی ہوں' اس سے پہلے میں اس کے لیے ایک بے نام جسم تھا' مس ایکس سمجھ لو لیکن تم اپنے جوش میں پھوٹ پڑے اور اب یہ مس ایکس مسز خاور بن گئی...... یوں بے عزتی ہوئی۔''

''گویا وہ بکتا رہتا اور میں خاموش رہتا؟''

''بالکل۔''

''وہ تمہارے جسم کی تعریف کرتا رہتا اور میں سُنتا رہتا۔''

''Exactly''

''But Why?''

''Because......'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اسے بیڈ روم میں آنے کا اشارہ کیا جہاں وہ تمام وجوہات' سوالات اور Because کا زندہ جواب بنی کھڑی تھی...... اور اس دلیل کے سامنے وہ لاجواب تھا!

(3)

خاور بیگ صاحب کی ایجنسی میں فوٹو گرافر تھا اور اسے یہ کام بے حد پسند تھا۔ دن

بھر طرح دار عورتوں کی تصویریں اُتارنا' انہیں ڈیویلپ کرنا' ان کے پرنٹ نکالنا' انہیں انلارج کرنا' انہیں ری ٹچ کرنا اور ان میں رنگ بھرنا۔ الغرض! وہ کام کے ہر مرحلہ سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ خاص طور پر وہ لمحات اس کے لیے عجب تھرل کے ہوتے تھے جب ٹرے میں دھرا وہائٹ پیپر آہستہ آہستہ کسی حسینہ میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا۔ یہ اس کے لئے کیمیا گر کا آخری لمحہ تھا۔ سونا بنتا ہے یا نہیں...... چنانچہ وہ بڑے اشتیاق سے ٹرے کو گھورتا رہتا اور آہستہ آہستہ گویا صدیوں کے وقفے میں تصویر جنم لیتی نظر آتی۔ پہلے سیاہ بال پھر لباس کی تہہ دار شکنیں' پھر بُوٹے' پھر آنکھیں ہونٹ اور ناک اور پھر باقی جسم' الغرض! پانی میں سے تصویر یوں طلوع ہوتی جیسے سمندر کی جھاگ سے وینس۔

اس کے لیے نفیسہ بھی ایسی ہی وینس تھی جو اگرچہ بحیرۂ روم کی شفاف اور منور جھاگ سے تو نہ اُبھری لیکن منوڑا کے گندگی بھرے ساحل پر یقیناً ملی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ساحل پر سیپ مل جاتے ہیں کہ خود بھی وہ اس وقت سیپ چُن رہی تھی۔ خاور اپنا یشیکا لیے غروب ہوتے سورج کی تصویریں اُتار رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ سے ہٹ کر وہ ساحل کے خاموش حصہ کی طرف آنکلا۔ اگرچہ دو تین تصویریں بنالی تھیں مگر وہ مطمئن نہ تھا۔ ادھر وقت بھاگا جا رہا تھا اور چند منٹوں بعد سورج نے سمندر کو چھونا تھا۔ چند لمحات کے لیے دنیا پر نگاہِ بازگشت ڈالنی تھی اور پھر رات بھر کے لیے ڈبکی لگالینی تھی۔ اچانک اسے قدرے فاصلے پر ایک لڑکی سیپ چُنتی نظر آئی تیز ہوا سے ہلتے بالوں نے چہرہ کا ہالہ کیا تھا۔ سمندر کی لہریں اس کے قریب آ کر جھاگ میں منتشر ہو رہی تھیں اور ڈوبتے سورج نے اس کے ننگے بازوؤں کو سونا پہنا دیا تھا۔ عین اسی وقت سورج سمندر میں اُتر گیا اور خاور نے شٹر دبا دیا۔ کلک' جلدی سے نیا اینگل لیا۔ کلک۔ پھر لڑکی کی پُشت کور کر کے سورج کو لیا۔ کلک...... پھر ایک گھٹنا ٹیک کر لڑکی کے اُڑتے بالوں اور پانی سے باہر نکلے آدھے سورج کو لیا...... کلک! سورج سونے کی ٹکیہ کی طرح منور تھا اور تاحدِ نگاہ سونا لہریں مار رہا تھا۔ جب ساحل پر آ کر جھاگ کے موتی ٹوٹتے تو قطروں میں رنگوں کے آنچل لہرا جاتے۔ خاور کے لیے یہ تخلیقی سرشاری کے وہ لمحات تھے جب انسان تخلیق کار بن کر فطرت سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور خود میں خالق کی تخلیقی قوت محسوس کرتا ہے۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر لہروں پر سونا ابھی تک بکھرا تھا۔ لڑکی

نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے کیمرہ لیے پایا۔

''پلیز مِس'' خاور نے کیمرہ کا فوکس درست کیا۔

''آں؟'' وہ حیرت سے بولی۔

کلک!

خاور نے بے اختیار ہو کر خوشی کا ایک نعرہ لگایا۔ چند منٹوں میں اس نے بہترین تصاویر حاصل کر لی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح چلا چلا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور شاید یہی کرتا اور نہیں تو کم از کم دیوانہ وار لہروں ہی میں کود جاتا مگر اسے اس لڑکی کا احساس تھا جو اسے ابھی تک حیرت سے تک رہی تھی اور اب اس نے پہلی مرتبہ اسے ایک پروفیشنل آنکھ سے دیکھا تو اپنے اعصاب میں وہی گدگدی محسوس کی جو انیتا ایکبرگ کی سب سے پہلی تصویر بنانے والے سویڈیش فوٹوگرافر نے محسوس کی ہوگی۔ آنکھوں کے کُھلے لینز جسم کا ایک ایک زاویہ جذب کر رہے تھے اور دماغ کے اعصاب کو پیغام دینے والا رٹیڈیا کلک کلک کر رہا تھا۔

''آئی ایم سوری'' وہ بولا۔ ''میں دراصل ایک فوٹوگرافر ہوں آپ کو جب اتنے خوبصورت پس منظر میں دیکھا تو گستاخی کر بیٹھا۔''

''سو آئی کین سی۔''

خاور نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر دیا۔ ''یقین کیجئے میرا ارادہ بُرا نہ تھا۔''

''اچھا؟'' اس کی دائیں بھوں سوالیہ انداز میں اوپر کو اُٹھتی گئی۔

''اگر آپ نے بُرا مانا ہے تو میں یہ تصویریں ضائع کر دیتا ہوں۔''

''کیا آپ واقعی تصویریں ضائع کر دیں گے۔''

''جی نہیں۔'' وہ ایمان داری سے بولا۔ ''یہ تصویریں اتنی اچھی ہیں کہ میں واقعی انہیں ضائع نہ کر سکوں گا۔''

وہ ہنسی اور سیپیوں سے بھرا تھیلا اٹھا کر چل دی۔ وہ متوازن قدم اٹھا رہی تھی کولہے کا خم اور کمر کے نیچے کی گولائیاں مل کر عجب انداز میں ہل رہی تھی۔ تیز ہوا سے شانوں پر بال اُڑ رہے تھے۔ وہ مبہوت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر کیمرہ اٹھا کر جاتی لڑکی کی ایک اور تصویر

لے لی۔ پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور وہیں گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ تاریکی پھیل رہی تھی' لہروں کا شور عجب پُر آہنگ لے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اعصاب نشہ میں ڈوبے تھے اور جسم میں انجانی کپکپی۔

تصاویر اس کے اندازے سے بھی زیادہ خوبصورت آئی تھیں۔ اس نے دراصل ایک فیشن میگزین کو ٹائٹل کے لیے تصویر دینی تھی۔ یوں تو تمام تصویریں ہی خوبصورت تھیں لیکن اس تصویر کو تو سب نے فنکاری کا شاہکار تسلیم کیا جس میں اس کے سر کا کلوز اپ اور سمندر میں نصف ڈوبا سورج ہم آہنگ ہو گئے تھے۔ کچھ اُڑتی لٹیں سورج پر تھیں چہرہ تاریک تھا مگر پیشانی' ناک اور ہونٹ سونے میں رنگے تھے۔ پس منظر میں پگھلے سونے کی ایک بڑی سی لہر جھاگ کا تاج پہنے اُمڈتی آ رہی تھی۔ یہ بلاشبہ ایسی تصویر تھی جہاں فوٹوگرافی تخلیقی مصوری بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس کی کلر ٹرانسپیرنسی میگیزن کے ایڈیٹر نے دیکھی تو اس نے بہت تعریف کی اور اگلے ہفتہ یہ تصویر تمام ملک کے سٹالوں پر سج رہی تھی۔

اس نے باقی تمام تصاویر کسی کو نہ دکھائیں اور ان کے انلارج کر کے اپنے کمرہ میں لگا دیئے۔ مگر یہ تصویریں اسے کیسے بھیجے؟ اپنی افراتفری میں اس کا پتہ لینا یاد نہ رہا تھا۔ بس اس کی طرف سے ٹیلیفون کا انتظار کرتا رہا اور پھر ایک دن جب فون آیا تو مارے گھبراہٹ کے اس کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ دو ہفتے کے انتظار کے بعد اس کی آواز سُن رہا تھا لیکن ڈھنگ سے بات نہ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے تصویریں دینے کے لیے ایک ریستوران میں شام کی چائے کے لیے اسے رضامند کیا۔

''میں اپنی بہن کے ساتھ آؤں گی۔'' اس نے جیسے تنبیہہ کی۔

''آپ سارے ٹبر کے ساتھ آ جایئے۔'' کہنے کے بعد احساس ہوا کہ کیا بے تکی بات کی تھی۔ لیکن وہ ہنس دی۔

وہ بہن کے ساتھ تو نہیں البتہ ایک سہیلی کے ساتھ آئی مگر پون گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد! اور آج اسے پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ چوڑی دار پاجامہ کتنا قاتل ہو سکتا ہے۔ اس نے تو تلیر قوم کا لباس سمجھ کر اسے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔ خاور کی مانند وہ بھی خاصی جھجکی سی تھی البتہ سہیلی خوب چٹک مٹک رہی تھی۔ رسمی باتوں اور چائے کے بعد جب

اس نے فریم میں انلارج تصویریں پیش کیں تو دونوں لڑکیوں کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔

''کیسی ہیں؟'' وہ اسے گم سم دیکھ کر بولا۔

اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو ان آنکھوں میں عجب فوٹو گرافی نظر آئی جو اس کا جواب بھی تھی اور انعام بھی۔

اس کے بعد وہ سہیلی کے بغیر آ کر ملی' پھر اس کے کنورے فلیٹ میں بھی آ گئی۔ پھر وہ ان کے گھر گیا اور بالآخر اُسے دلہن بنا کر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب ایک دن خاور نے اس سے کہا۔

''خوش قسمتی کے بھی کوئی روپ ہیں مگر مجھے یہ سیکسی سوزن کے رُوپ میں ملی ہے۔''

وہ یہ سُن کر خوشی سے کھل اُٹھی وہ سوزن تھی یا نہیں یہ تو الگ بات ہے لیکن اس کے سیکسی ہونے میں دونوں کو کوئی شبہ نہ تھا' بہت محبت کرنے والی' بہت محنت کرنے والی مگر رات کو بستر پر مکمل طور سے خراج وصول کرنے والی عورت تھی۔ خاور اس کی تصویریں اُتارتا نہ تھکتا تھا۔ جب ہر لباس اور ہر پوز میں تصویریں بنا چکا تو پھر کم لباس اور بعد ازاں بے لباسی میں تصویریں بنا ڈالیں۔ گو اس نے اخلاقاً انکار کیا مگر وہ اپنے جسم کی سب سے بڑی عاشق خود تھی۔ خاور سے بھی بڑھ کر اور یہ اس کی نرگسیت کی تسکین کا ایک خوبصورت انداز تھا۔ ان تصویروں کو ہمیشہ تالے میں رکھا جاتا اور جب دونوں موج میں آتے تو یہ خفیہ البم کھول بیٹھتے' کبھی یہ تصویریں تحریک کا باعث بنتیں تو کبھی ٹانک کا کام کرتیں۔

ایک دن چاؤ میں آ کر بولا۔ ''اگر یہ تصویریں ''پلے بوائے'' یا کسی ایسے ہی امریکی پرچے کو بھیج دوں تو ہزاروں ڈالر کی صورت میں زرِ مبادلہ کما سکتا ہوں۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''مگر اس زرِ مبادلہ کو ڈکلیئر نہ کرنا۔''

''ہاں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''پھر اسی طرح ہم سرمایہ دار بن جائیں گے۔''

''اور پھر تم اپنی ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لینا۔''

''اپنی کیوں؟ بیگ صاحب کی ایجنسی ہی خرید لیں گے۔''

''میں اس ایجنسی کی فوٹوگرافر بنوں گی۔''

وہ خوب ہنسا۔''تم؟''

''ہاں۔''

''کیوں۔''

''میں میل ماڈلز کی تصویریں اُتاروں گی۔''

''او کُتیا! ایک میل ماڈل کا تو کچومر نکال دیا ہے۔ اب باقیوں کا ستیاناس کرنا ہے۔''

''اور کیا'' وہ دیدے مٹکا کر بولی۔''کیونکہ کار نہیں ہے اس لیے ہر سال اس کا ماڈل بدلنے سے تو رہی۔ لہٰذا میل ماڈل ہی بدلنے چاہئیں۔''

اسی طرح چہلیں کرتے کرتے نفیسہ نے یہ فرمائش کی کہ اس کی بھی ایک خوبصورت سی تصویر کسی اشتہار میں آئے۔

''چھوڑو یار۔'' وہ بولا۔''بیوی کو اشتہار نہیں بنایا جاسکتا۔''

''اس سے پہلے بھی تو تم نے سمندر والی تصویر کا کور بنایا تھا۔''

''وہ اور بات تھی۔''

''کیا اور بات تھی۔''

''اس وقت تم محض ایک لڑکی تھیں میں تمہارے نام تک سے بھی واقف نہ تھا۔ مگر اب تم میری ہو۔''

''بھئی کیا بوگس بات کی ہے۔ کسی کو کیا پتہ کہ یہ تمہاری بیوی کی تصویر ہے جیسے اور ماڈلز کی چھپتی ہیں ویسے ہی یہ بھی چھپے گی۔''

''مگر......''

نفیسہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔''جان! میری قسم۔ چلو اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے تصویر کا معاوضہ نہ وصول کرنا۔''

نفیسہ کی نرگسیت تسکین کا یہ نیا انداز ترک کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ آئینہ میں اپنے جسم کی پرستش اور خاور کی پُوجا سے ایک قدم آگے جانا چاہتی تھی۔ اب تک وہ اپنی آنکھوں

سے خود ہی اپنے جسم کو خراجِ تحسین پیش کرتی آئی تھی۔شادی سے پہلے کمرہ بند کر کے تنہا تنہا' شادی کے بعد خاور کے ہاتھوں نے آنکھوں کا کام کیا تھا مگر اب اسے ہزاروں آنکھوں کے آئینے کی ضرورت تھی۔لاتعداد مرد اس کی تصویر دیکھ کر خریداری کی تحریک محسوس کریں گے یہ احساس ہی نشہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔اگرچہ خاور نے سختی سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ بھی ٹرینڈ بیوی تھی۔اپنے خاوند کو ڈھب پر لانا جانتی تھی چنانچہ بیوی نے اس وقت چوٹ ماری جب لوہا تپ رہا تھا۔

(4)

وہ ساحل کی چمکدار ریت پر لیٹی تھی۔بال بے ترتیب تھے۔پاؤں کے پاس ٹوٹتی لہر کا جھاگ دمک رہا تھا۔آدھ کھلی آنکھوں میں جیسے کنوارپنے کے کچے سپنوں کا رنگ تھا۔ نیم وا ہونٹوں سے دو تین دانت نظر آ رہے تھے۔وہ عجب بے خودی بلکہ خود سپردگی کے عالم میں لیٹی تھی یوں محسوس ہوتا گویا اس کے جنس نے جسم کے گرد ایک ہالہ بنا رکھا ہو۔ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنوں نے اس کے جسم پر روشنی اور سایوں کا عجب کھیل رچایا تھا۔اس نے کھڑے ہو کر ایسے اینگل پر کیمرہ رکھا تھا کہ افقاً اور عموداً دونوں طرح سے جسم اُبھر آیا تھا یوں کہ سانس کی لرزش محسوس ہو رہی تھی۔

ٹیبل لیمپ کی روشنی کے دائرہ میں نفیسہ چمک رہی تھی مگر خاور اس وقت شوہر کے برعکس پروفیشنل فوٹو گرافر تھا۔چنانچہ وہ تنقیدی نگاہ سے ایک ایک پہلو کا تجزیہ کر رہا تھا۔چہرہ کو رِی ٹچنگ کی ضرورت نہ تھی اس لیے اسے بالکل نہ چھیڑا صرف ہونٹ سُرخ کر دیئے۔ لباس پر چند ایسے شیڈ پیدا کیے کہ بے لباسی کا احساس ہو۔چھاتیوں کے نیچے شیڈ دے کر ان کی گولائیاں مزید نمایاں کر دیں۔پھر نپل اُجاگر کرنے کے لیے پنک رنگ میں برش ڈبویا مگر وہ فن کی خاطر اس حد تک جانے کو تیار نہ تھی لیکن جو کچھ کیا یہ بھی بہت تھا۔

نفیسہ کے پاؤں کے پاس جب میچنگ رنگ کے موتیوں کے ہار کے ساتھ صابن کی تصویر چسپاں کر دی گئی تو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا گویا نفیسہ کو اس صابن سے نہانے کی ضرورت نہیں بلکہ صابن کو نفیسہ سے نہانے کی ضرورت ہے۔شاید اسی لیے تصویر دیکھی تو بیگ صاحب کو جلتا ہیٹر چھو لینے کا احساس ہوا وہ کہہ رہے تھے۔

''خاور صاحب! کل کی بات کا مجھے بہت افسوس ہے۔''

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

''ایک لحاظ سے غلطی تمہاری بھی ہے۔''

''کیسے سر؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اپنی بیوی سے ماڈلنگ نہ کرانی چاہیے تھی اور پھر اگر ایسا کیا تو مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا تا کہ میں کوئی ایسی ویسی بات نہ کرتا۔''

''سر! بات یہ ہے کہ میری بیوی ماڈلنگ نہیں کرتی، دراصل وہ بہت۔ بہت فوٹو جینک ہے۔اس لئے.....اس لئے اس نے سوچا۔یعنی کہ میں نے سوچا.....''

بیگ صاحب نے مسکرا کر بات کاٹی۔ ''کوئی بات نہیں، تمہاری وائف۔آئی مین، تصویر بہت اچھی آئی ہے اور پارٹی یقیناً اسے پسند کرے گی۔''

''سر میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ تصویر نہ ہی استعمال کرتے تو.....''

''نان سنس۔''

''سر!''

''میں تو فرم سے تمہاری اس ڈیوشن سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ چنانچہ آج صبح میں نے آفس سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا ہے کہ کل کی تاریخ سے تمہاری پے میں ڈھائی سو کا اضافہ کر دے۔''

''تھینک یو سر!''

''تھینک یو سر نہیں، تھینک یو مسٹر خاور''

''نہیں سر ایسی تو کوئی بات نہیں میں آپ کا تابعدار ہوں۔''

''خاور مائی بوائے! تم میں بہت ٹیلنٹ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم میں اپنے کام سے ڈی ووشن ہے، تم اگر اسی طرح محنت اور لگن سے کام کرتے رہے تو میں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا دوں گا۔''

''بڑی مہربانی سر۔''

بیگ صاحب بولے۔ ''مہربانی کی کوئی بات نہیں جب تم ہمارے لیے اتنا کچھ

کرنے کو تیار ہو تو ہمیں بھی ہر طرح سے تمہاری قدر کرنی چاہیے۔ رضوان صاحب امریکہ جانے کی سوچ رہے ہیں اگر ان کا جانا طے ہو گیا تو میں تمہیں ان کی جگہ جنرل منیجر بنا دوں گا۔'' انہوں نے رک کر اپنے الفاظ کے اثرات اس کے چہرہ پر سرخی کی مانند پھیلتے دیکھے اور پھر بولے۔ ''اور اگر تم نے وہاں اپنی ورتھ ثابت کر دی تو کیا پتہ دو چار سال بعد تمہیں لاہور برانچ کا نگران بنا دیا جائے۔''

تو بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ خوش قسمتی ایک بدصورت بلکہ کریہہ المنظر شخص کے روپ میں مل جاتی ہے۔

یہ خوش خبری سُن کر نفیسہ برس پڑی۔

''اور تم نے جواب میں کیا کہا۔''

''کیا کہنا تھا شکریہ ادا کیا۔''

''شکریہ سے مراد نہیں، کیا اس خوشی میں تم نے انہیں دعوت کا کہا۔''

''نہیں تو۔''

''کیوں؟''

''مجھے خیال ہی نہ آیا۔''

''یار کمال کے آدمی ہو آدمی بھی کیا نرے فوٹو گرافر ہو۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ شرمندگی سے بولا۔

وہ اسے بچہ کی طرح چمکار کر بولی۔ ''کوئی بات نہیں اب ڈنر کی دعوت دے آنا۔''

جب اس نے اگلے دن رات کے کھانے کے لیے کہا تو بیگ صاحب نے دعوت قبول کرتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔

''ایمان سے کہنا یہ ڈنر کس کا آئیڈیا تھا۔''

''سر۔'' وہ شرمسار ہو کر بولا۔ ''میری وائف کا۔''

وہ ہنسے۔ ''میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ ورنہ تم کل خود ہی کہتے۔''

''جی سر۔'' وہ فخر سے بولا'' وہ بہت سمجھدار عورت ہے۔''

''یس! یس! اور خاصی پریکٹیکل بھی۔''

''یس سر!''

بیگ صاحب نہ صرف وقت سے نصف گھنٹہ پہلے پہنچے بلکہ نفیسہ کے لیے ایک خوبصورت میکسی بھی لے کر آئے۔

پھر جواب میں بیگ صاحب نے ''جبیں'' میں ان سب کو مدعو کیا۔

پھر اس کے جواب میں نفیسہ نے ان کا ایک اور ڈنر کیا تو بیگ صاحب مگر مچھ کی کھال کا امپورٹڈ شولڈر بیگ لے کر آئے۔ انہیں دعوتوں کے دوران خاور منیجر بنا دیا گیا ادھر جنرل منیجر کا جانا بھی طے ہی تھا اور خاور کو یقین تھا کہ سال کے اندر اندر اس کی تنخواہ چار صفروں والی ہو جائے گی۔

(5)

خاور لیٹ کام کر رہا تھا کہ بیگ صاحب کا فون آیا وہ اسے گھر پر بُلا رہے تھے۔ بیگ صاحب کو فارن ٹور سے واپس آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے اور وہ کام میں مصروف رہے تھے۔ خاور پہلی مرتبہ ان کے گھر آیا تھا۔ سوسائٹی میں نہایت نفیس کوٹھی اور اندر سے یوں آراستہ گویا کسی فلم کا سیٹ ہو۔ اس خوبصورت کوٹھی میں اگر کوئی بدصورتی تھی تو وہ خود بیگ صاحب ہی تھے۔ ان کی بیگم بھی چالیس سال سے کم نہ ہوں گی اور بس یوں ہی سی تھی۔

''خاور! مائی بوائے۔'' وہ اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ ''میں نے جنرل منیجر سے تمہارے بارے میں پوچھا تھا اور وہ تمہاری بہت تعریف کرتا تھا۔''

''سر! یہ ان کی عنایت ہے۔''

''You have done well! Boy''

''رضوان صاحب کا امریکہ جانے کا تو کچھ بن نہیں رہا۔''

''کوئی بات نہیں سر!''

''خاور میں تمہیں ہر لحاظ سے بوسٹ آپ کرنا چاہتا ہوں۔''

''تھینک یو سر!''

''ہم ایک نئی پوسٹ کریئیٹ کر رہے ہیں۔ ٹورنگ جاب' ایئر ٹریول' فور سٹار ہوٹلز'

ڈبل پے' لگژری 'للوری..... Interested؟ ''

خاور کا دل خوشی سے چھلانگیں لگا رہا تھا۔

''سر! سر......'' اس کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور آنکھوں سے پانی!

بیگ صاحب اسے بغور دیکھتے رہے اور سگار کے کش لگاتے رہے۔

''Then its done?''

''Done Sir''

جب دونوں نے ہاتھ ملایا تو خاور کانپ رہا تھا۔

کافی پیتے ہوئے بیگ صاحب اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر بولے۔

''خاور میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں اور ہر لحاظ سے تمہیں پروموٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

خاور نے بولنے کے لیے مُنہ کھولا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''بار بار تھینک یو نہ کہو۔ تم ایک نوجوان اور محنتی انسان ہو اور تمہیں زندگی میں آگے ہی جانا ہے۔''

کچھ دیر تک وہ رُک کر سگار پیتے رہے۔ پھر جُھک کر رازدارانہ لہجہ میں بولے۔

''اب جو میں تم سے کہوں گا یہ بالکل ذاتی اور کونفیڈینشل ہے۔ Not a word to any one.'' وہ انگلی ہلا کر بولے۔

''I understand, Sir.''

''ہم چند دوستوں نے ایک خفیہ کلب بنا رکھی ہے۔ Key Club''

''کی کلب؟''

''ہاں'' وہ چابیاں ہلاتے ہوئے بولے۔ ''یہ چند بے تکلف دوستوں کا سرکل ہے۔ مہینہ میں ایک یا دو مرتبہ ہم سب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔''

☆......☆......☆

''ایک۔ دو۔ تین۔''

سب جھپٹا مار کر آگے بڑھے اور اگلے لمحے باکس خالی تھا اور خاور کا ہاتھ بھی! سب خوش ہو کر چابیوں کے ساتھ بندھے ٹیگ پر سے نام اور پتے پڑھ رہے تھے۔

"IGOT NAFEESA" بیگ صاحب خوش ہو کر چلائے پھر انہوں نے
خاور کے خالی ہاتھ دیکھے اور اس کا لٹکا ہوا منہ اور دیدے نچا کر بولے۔
"This is the last surprise" وہ اس کا شانہ تھپتھپا کر بولے۔
"بعض اوقات کسی کی بیوی منتقلی کورس میں ہوتی ہے تو اس رات ایک چابی کم ہو جاتی ہے۔ جو چابی لینے سے رہ جائے وہ کانا چور بنتا ہے۔" اس پر سب نے کانا چور کانا چور کہہ کر قہقہے لگائے۔ رضوان صاحب بولے۔
"کوئی بات نہیں یار۔"
"Next time you wll be lucky" دوسرے نے کہا اب سب کو جانے کی جلدی تھی اور وجہ بھی ظاہر تھی۔
مگر ان کی کاریں ایک ہی راستہ پر کیوں جا رہی ہیں۔ اس نے تعجب سے سوچا۔
اب ساری رات کہاں بسر کرے۔ گھڑی دیکھی تو دس ہو رہے تھے۔ چلو سینما میں چلتے ہیں۔ سڑک پر چلتے چلتے اسے ایک فلم پوسٹر نظر آیا فلم تھی "THE KEY" اس میں صوفیہ لورین تھی۔ پوسٹر کے آگے کھڑا ہنستا رہا "دی کی" کی کلب۔ واہ! کیا اتفاق بلکہ حُسن اتفاق ہے اور پوسٹر پر لکھی عبارت پر اس کی نظریں جم گئیں۔
"To THE I WED WITH THIS KEY"
وہ ہنسا۔ کیا خوب لکھا ہے۔ چلو یہی فلم دیکھتے ہیں اور جب فلم دیکھ کر اور کئی گھنٹے ایک بار میں ضائع کر کے صبح چار بجے کے قریب گھر پہنچا تو سب کاریں ابھی تک وہیں موجود تھیں۔

O.....O.....O

موری کی اینٹ

''حرام زادی!'' اس کی ماں دانت کٹکٹا کر بولی ''بول یہ کس خصم کا ہے؟''

بیٹی نے بڑی بیزاری سے ماں کو دیکھا۔ ایک لحہ کو ماں اور بیٹی کی آنکھیں چار ہوئیں سیاہ اور چندھی آنکھوں کا یہ ملاپ چند ثانیوں کا تھا اس کے بعد بیٹی نے لاپرواہی سے شانے اچک کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی ماں چیخ کر بولی ''کتیا! بولتی کیوں نہیں۔''

''کیا بولوں؟''

''یہ کس کا ہے؟''

''اوہو! تم تو جان کو آ گئی ہو۔''

''حرام خور! میں تو تیری جان کھا لوں گی میں تو تیرا خون پی لوں گی۔ میں تو تیرا......'' بڑھیا چیخ کر بولنے سے ہانپنے لگی تھی۔ اس نے دوپٹے کے کونہ سے ہونٹوں سے باہر آئے ہوئے تھوک کو صاف کیا اور غصیلی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی بیٹی اس سے لاپروا بیٹھی آرام سے ایک ٹانگ زور زور سے ہلا رہی تھی۔ ذرا دم لینے کے بعد وہ ایک دم پھر برس پڑی۔ ''بول۔ کتی، کمینی!''

اب کتی کمینی بھی چیخ کر بولی ''کیا بک بک لگا رکھی ہے۔''

ماں ایک لحہ کو تو سُن رہ گئی اور اس کے بعد وہ اسے چیخ چیخ کر گالیاں سنانے لگی۔

جواب میں بیٹی بھی کم نہ تھی۔

دونوں ماں بیٹیوں میں یہ اس ناٹک کا تیسرا دن تھا۔ جب سے جنتے کی ماں کو پتہ چلا تھا وہ اس کے پیچھے پڑی تھی اس سے مرد کا نام پوچھتی تھی مگر بیٹی نے ابھی تک اسے کچھ بھی نہ بتایا تھا۔ اس موضوع پر تنہائی میں کچھ اس طرح سے گفتگو کا آغاز ہوتا۔

''یہ کمیٹی کے داروغہ کا تو نہیں؟''

''نہیں!''

''ان چھڑوں کا تو نہیں؟''

''کون سے......؟'' وہ جیسے انجان بن کر پوچھتی۔

''وہی جن میں ایک ڈاڑھی والا ہے اور جو ہر وقت جانگیہ پہنے پھرتے ہیں۔''

''نہیں''

''سوچ لے......'' اس کی ماں اپنی دانست میں اُسے سوچ کا موقع دینے کے بعد پُوچھتی ''کہیں وہ اسی ڈاڑھی والے کا تو نہیں؟''

''نہیں! نہیں!!'' وہ چیخ کر کہتی۔ ''کیا میری جان کو آ گئی ہو!''

''میں تیرا گھر سے نکلنا بند کر دوں گی۔''

''کوٹھے کون کمائے گا؟''

اس پر بڑھیا چپ سی ہو جاتی۔ کچھ دیر کو خاموش رہتی پھر وہ پینترا بدل کر یوں بات چھیڑتی ''میری بیٹی بتا دے ورنہ برادری میں بڑی بدنامی ہو گی۔''

''اونہہ! برادری میں ایسی کون ہے جو مجھ پر انگلی اُٹھا سکے؟''

''ایسے معاملہ میں ہر ایک بات کر سکتا ہے۔''

''میں ایک ایک کا سر توڑ دوں گی۔''

''میں ہی نہ تیرا سر توڑ دوں۔'' بڑھیا پھر گرم ہو جاتی۔ ادھر بیٹی بھی گرم ہو جاتی اور بات گالیوں تک آ جاتی۔ بڑھیا نے ابھی تک اپنے دونوں بیٹوں سے اس راز کو چھپائے رکھا تھا' ان دونوں میں سے کوئی گھر میں آتا تو بڑھیا فوراً خاموش ہو کر جنتے کے پاس سے اٹھ جاتی۔ لیکن کب تک' تین دن کی بک بک کے بعد بڑھیا بھی عاجز آ گئی اور اس نے رات کو دونوں بیٹوں سے ذکر کر دیا۔ جنتے چارپائی پر چت لیٹی بظاہر تو آسمان کو گھور

رہی تھی لیکن اس کے کان ان تینوں کی سرگوشیوں پر لگے تھے۔ بڑے بیٹے نے حیرت سے ماں کی بات کو سنا۔

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

اس کی ماں جل کر بولی۔ ''کیسے کا کیا مطلب ہے ایسی حرام زادیاں سب کچھ کر سکتی ہیں۔''

''میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔'' چھوٹے کے فولادی بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ ''میں اس کا سر توڑ دوں گا۔''

''تم چپ کرو!'' بڑے نے اسے روکا اور پھر ماں کی طرف مخاطب ہو کر بولا ''مگر وہ ہے کس کا؟''

ماں کو اس بات پر پھر تاؤ آ گیا۔ ''یہی تو کتیا بتاتی نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں تین دن سے اس کے پیچھے پڑی ہوں۔ اسے سمجھایا اس کے آگے ہاتھ جوڑے اسے ڈرایا مگر وہ تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔''

''مگر وہ اس کا نام کیوں نہیں بتاتی؟''

''پوچھ لو۔''

جنتے نے جب ان تینوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو چارپائی سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ ایک لمحہ کو اس کی بڑے بھائی سے آنکھیں چار ہوئیں اور اس کے بھائی کو اپنی بہن کے چہرہ پر عجیب سا سکون نظر آیا۔ جنتے نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ چھوٹے نے اچھل کر اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اس کے مُنہ سے نکلنے والی آواز گال پر پڑنے والے مکے ہی میں دب کر رہ گئی۔ وہ ہائے کہہ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ زمین پر جھکی ہوئی تھی کہ اوپر سے بڑے بھائی کی لات نے اسے فرش کے ساتھ ملا دیا۔ ماں نے بالوں سے پکڑ کر اس کا مُنہ اونچا کیا تو اس کے مُنہ سے خون کی دھار بہہ رہی تھی، مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ ناک اور ماتھے پر کچے فرش کی مٹی لگی تھی۔

''بول کتیا!''

اس کی ماں چیخ کر بولی۔
''بتا......'' چھوٹا بھائی بھی گرجا۔
''نہیں''
اس کے اٹھے ہوئے چہرے پر تھپڑ پڑا اور ساتھ ہی کمر میں ایک لات۔ وہ ہائے کہہ کر پھر دوہری ہوگئی۔

''بول کمینی بول'' اس کا بڑا بھائی چیخا۔ اس کے ہاتھ میں پھونکنی آ گئی تھی اور وہ پوری قوت سے اسے مار رہا تھا۔ ادھر چھوٹا بھائی مختلف زاویوں سے اسے لاتیں مار رہا تھا اور ماں صرف گالیاں نکالنے اور چیخنے پر اکتفا کر رہی تھی۔ اردگرد کے لوگ ان کے دروازے پر جمع ہو گئے تھے مگر اندر سے کنڈی لگی تھی اس لیے وہ باہر سے آوازیں دے رہے تھے۔

''خیرو!'' اس کی ماں بولی ''بس کر دے۔''

''تو چپ کر!'' وہ جواب میں چیخا۔ بڑھیا نے لہولہان جنتے کو بچانے کے لئے درمیان میں آنا چاہا لیکن اس کے بھی ایک ہاتھ ایسا پڑا کہ وہ بلبلا کر علیحدہ ہوگئی۔ جب دیکھا کہ وہ اُنہیں نہیں روک سکتی تو اس نے دروازہ کھول دیا اور باہر شور مچاتے لوگ اب اندر آ کر شور مچانے لگے۔ بہر حال ان سب نے ان دونوں بھائیوں کو ہٹایا اور بے ہوش جنتے کو اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ اس کی ماں نے جلدی جلدی دودھ گرم کیا بازار سے آدھ چھٹانک گھی منگا کر اس میں ڈالا' دودھ میں چینی ملاتے وقت اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی جنتے سے سبھی پیار کرتے تھے وہ تو اس پر جان وارتی تھی۔ وہ کبھی بھی اتنی ضدی نہ تھی ہاں زبان کی تیز ضرور تھی لیکن وہ عموماً ضد نہ کرتی برادری کی عام لڑکیوں اور دوسری بھنگنوں کی طرح وہ ادھر ادھر ماری ماری نہ پھرتی تھی۔ سب برادری والے اس کی تعریف کرتے تھے اور جتنی پھرتی سے وہ کام ختم کر لیتی تھی اس کی وجہ سے اکثر بھنگیوں کی اس سے شادی کی تمنا تھی۔ بلکہ بعض گھروں سے باضابطہ پیغامات بھی آ چکے تھے مگر ابھی تک ماں اس کی شادی نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی عمر بھی ایسی زیادہ نہ تھی۔

ان کے گھر کا چھوٹا سا آنگن عورتوں مردوں اور بچوں سے بھر چکا تھا۔ کچھ عورتیں بے ہوش جنتے کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں' اس کے دانت سختی سے بند تھے ایک

عورت نے پنکھے کی ڈنڈی ایسی سخت اُنگلی اس کے دانتوں میں دبا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پانی حلق میں جانے کے بجائے ہونٹوں کے کنارے سے باہر بہہ جاتا۔ باقی عورتیں چارپائی کے گرد کھڑی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ مردوں نے دونوں بھائیوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ بڑا اب بالکل خاموش تھا ایسے لگتا تھا جیسے اس کا جنون اتر گیا ہو لیکن چھوٹا اب بھی گرم تھا اور وہ مسلسل گالیاں نکالے جا رہا تھا۔ کچھ عورتیں بڑھیا کے پاس بیٹھی ہاتھ نچا نچا کر اس سے جھگڑے کی وجہ پُوچھ رہی تھیں مگر اس نے کسی کو بھی صحیح وجہ نہ بتائی بلکہ تینوں نے ہی لوگوں کو ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹال دیا اور اصل وجہ کسی کے مُنہ سے بھی نہ نکلی۔

جنتے کو ہوش آ گیا تھا اس نے ایک دو مرتبہ آنکھیں کھول کر اپنے گرد ہجوم کو دیکھا اور کراہ کر پھر آنکھیں بند کر لیں' اس کی ماں نے اسے سہارا دے کر اُٹھایا اور گرم دودھ کا پیالہ جس میں گھی چمکیلے دائروں کی صورت میں تیر رہا تھا' اس کے مُنہ سے لگا دیا۔ مگر اس نے پینے کی بجائے ہاتھ مار کر اسے گرا دیا اس پر خیرو کو پھر تاؤ آ گیا۔

''چھنال کے نخرے تو دیکھو......'' وہ دانت پیس کر بولا ''میں تیرا ستیاناس کر دوں گا۔''

لیکن اسے باقی لوگوں نے گھر سے باہر دھکیل دیا۔ خیرو کے ساتھ ہی بڑا بھائی بھی باہر نکل گیا اور پھر آہستہ آہستہ باقی لوگوں سے بھی آنگن خالی ہو گیا۔ جنتے کی ماں نے عورتوں کو بھی چلتا کیا اور پھر اس نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا' وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی کچھ خون چہرے پر ایک لکیر کی صورت میں جم گیا تھا ایک دو جگہ نیل بھی پڑ گئے تھے۔ گو اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چوٹوں کی درد سے وہ مسلسل کراہے جا رہی تھی۔ اس کی ماں کو خاموش آنگن میں عجیب سی ویرانی کا احساس ہو رہا تھا۔ جنتے نے ایک لمحہ کو آنکھیں کھولیں اور ماں بیٹیوں کی آنکھیں چار ہوئیں اس دفعہ بھی سیاہ اور چندھی آنکھوں کا یہ ملاپ چند ثانیوں کا تھا۔ بیٹی نے مُنہ پھیر لیا تھا۔ ماں اس کے سرہانے بیٹھی اس کا جسم دباتی رہی پھر کوئلے انگیٹھی میں ڈال کر لے آئی اور ٹکور کرنے لگی۔

ماں رو رہی تھی۔

بیٹی خاموش تھی!

''جنتے!''

وہ خاموش رہی۔

''دیکھ..... مجھے بتا دے۔ تُو اس کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کر دے تو میں تیرے بھائیوں سے اس کا سر تڑوا دوں گی خیر سے۔''

''میں اس کا سر ہی تو تڑوانا چاہتی نہیں''

''تو اسی لیے تو اس کا نام نہیں بتا رہی تھی..... اس کا مطلب ہے کہ اس میں تیری اپنی حرام زدگی بھی شامل تھی، تو یہ زبردستی نہ تھی۔''

''.....''

''تو اتنی مار محض اس لیے کھائی کہ کوئی اسے کچھ نہ کہے۔''

جواب میں جنتے صرف کراہ دی۔ اس نے ماں کا ہاتھ اٹھا کر پسلی پر رکھا۔ ''درد ہے؟''

''ہاں!''

اس نے جسم کے اس حصہ پر ٹکور شروع کر دی۔

''زیادہ درد ہے؟'' ماں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''ہاں!''

''حرام زادے، قصائی کہیں کے! کس طرح مارا ہے'' وہ اسی طرح بڑبڑاتی رہی پھر اسے ایک دم طیش آ گیا ''یہ سب تیری کرتوت ہے!'' ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے میلے دوپٹے کے کونے سے اُنہیں صاف کیا اور ٹکور جاری رکھی۔

''تجھے دودھ لا دوں؟''

''نہیں۔''

''پی لے۔''

''نہیں۔''

''تو یوں ہی مر جائے گی۔ میں تجھے اس میں گھی ڈال دوں گی، ذرا طاقت آ جائے گی۔''

''میرا اس وقت دل نہیں چاہتا۔''

اور ایک دم بڑھیا پھر پہلے موضوع پر آ گئی ''یہ سب ہوا کیسے؟'' جنتے خاموش رہی مگر بڑھیا تو اب بولتی رہی ''میرا خیال تو اسی ڈاڑھی والے کے لیے تھا۔''

''وہ کیوں؟'' جنتے پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''وہ ہے ہی ایسا اس نے ایک دفعہ ایسی حرکت کی تھی۔''

''وہ'' جنتے حقارت سے ہنس دی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے پر عجیب سی نرمی آ گئی اب تک اُس کے نقوش میں تناؤ تھا لیکن اب جیسے وہ اپنی اصل جگہ پر آ گئے ہوں۔ اس کی آنکھوں میں بھی انوکھی چمک لہرا گئی۔ شاید وہ ''اس کا'' تصور کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا لیکن خاموش رہی۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی شاید وہ ''ان لمحات'' کے تصور میں تھی۔ وہ جسم کی درد اور ٹکور کرنے والی ماں سے لاپروا معلوم ہوتی تھی اور اب جو بولی تو اس کی آواز میں عجیب نرمی اور گھلاوٹ تھی۔

''وہ تو بابو ہے!''

''بابو!''

''ہاں!'' وہ ایسے بولی جیسے کسی بچے کو پیار سے کوئی بات سمجھا رہی ہو۔ ''وہ بابو ہے بڑے اچھے کپڑے پہنتا ہے۔''

''اس نے تجھے کچھ پیسے دیے تھے؟''

جنتے نے برا مان جانے والے انداز سے اس کی طرف دیکھا ''پیسے؟ کیسے پیسے؟ میں کوئی کنجری ہوں۔''

''میں نے سوچا شاید۔''

مگر جنتے بات کاٹ کر بولی ''میں نے عزت نہیں بیچی۔''

''عزت نہیں بیچی۔'' اس کی ماں نے دہرایا ''تو کیا آلو چھولے بیچے ہیں اری! یہی تو عزت بیچنا ہوتا ہے۔''

''نہیں!'' جنتے چیخ کر بولی مگر ساتھ ہی کراہ اُٹھی ''اسے مجھ سے محبت ہے!''

''کیا بکتی ہے، کبھی کسی بابو نے کوٹھا کمانے والی سے بھی محبت کی ہے۔''

''وہ ان خراب بابوؤں میں سے نہیں ہے۔اس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی۔ وہ کہتا تھا میں شادی کر کے تجھے یہاں سے لے جاؤں گا......وہ مجھے کراچی لے جائے گا۔وہ مجھے پڑھائے گا وہ......''

اس کی ماں بے اختیار ہنس دی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

''میری بھولی بچی! تو کس جال میں پھنس گئی ہے۔تیری پشتیں ان بابوؤں کا گند اٹھاتی آ رہی ہیں تو جس بابو کی رانی بننے کی آس لگائے بیٹھی ہے اس کا گند تیرے ناخنوں میں ہے۔اس کے گند کی بو تیرے جسم میں بھی ہے۔ ہماری دال روٹی ان بابوں کے گند سے چلتی ہے۔وہ گند جس کا دُنیا میں کوئی فائدہ نہیں وہ ہمیں روٹی دیتا ہے......اور تو اس کی بیوی بنے گی؟''

لیکن اب وہ ہنس نہیں بلکہ رو رہی تھی۔جنتے خاموش تھی۔کچھ دیر بعد وہ بولی۔

''ماں! وہ ایسا نہیں، وہ تو بہت اچھا ہے۔ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔''

''میٹھی میٹھی باتیں''......اس کی ماں نے اداسی سے دہرایا''جب تک مطلب نہیں نکل جاتا سبھی بابو میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں لیکن بعد میں وہ تم ایسیوں کو اسی طرح بھول جاتے ہیں جیسے ہم کمیٹی کی لاری میں ٹوکری اُلٹ کر بھول جاتی ہیں۔''

''مگر ماں......''

''بک مت!''اس نے غصے سے اپنی بیٹی کی بات کاٹی۔اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر ایک مرتبہ پھر چندھی اور سیاہ آنکھوں کا ملاپ ہوا۔چندھی آنکھوں میں مامتا کا درد تھا سیاہ آنکھوں میں محبت کا اعتماد! ماں نے سوکھے ہاتھوں میں اپنی بیٹی کے چہرے کو تھام لیا۔اس کی آنکھیں بیٹی کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ سے پیلے پیلے اور میلے میلے دو دانت نظر آ رہے تھے،اس کے لب کپکپائے''میری بچی! میری بھولی!! تو کتنی بے وقوف ہے''

''تم تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو وہ دل کا برا نہیں۔سچ! اگر تم اس کی باتیں سن لو تو تم بھی اسے اپنا سب کچھ دینے پر تیار ہو جاؤ۔''

''چل حرافہ۔''

''نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔ وہ کالج میں پڑھتا ہے اور بہت شریف ہے۔''

''تم نے اس شریف خان کو اس کے کرتوت کا بتایا؟''

''اس کے کرتوت کیسے؟''

''اچھا چل تیرے ہی سہی۔ اسے ابھی تک بتایا کہ نہیں۔''

''نہیں!''

''کیوں''

''میں...... میں......'' جنتے کی آواز اس کا ساتھ نہ دے رہی تھی۔

''یہ کیوں نہیں کہتی کہ اس نے تیرے مُنہ پر جوتا مار دیا۔''

''یہ بات تو نہیں۔ میری ہمت ہی جواب دے گئی؟''

''کیوں'' بڑھیا کی آواز میں غراہٹ تھی۔

مگر جنتے نے جواب نہ دیا۔ اس کی ماں نے کافی دیر اس کے ساتھ سر کھپایا مگر اس پر اب جھلاہٹ سوار تھا اس لئے اب وہ اس کے سوالوں کے اُلٹے سیدھے جواب دے رہی تھی۔ وہ بھی خاموش رہی اور اسے ٹکور کرتی رہی۔

جنتے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

تین دن تک وہ گھر میں پڑی رہی اس کے بھائیوں نے واپس گھر آ کر ہنگامہ کھڑا کرنا چاہا مگر ماں نے انہیں ٹھنڈا کر دیا۔ تین دن بعد اس نے معمول کی مانند صبح سویرے ہی جھاڑو اور ٹوکری اُٹھائی۔ آگے وہ سر پر ٹوکری رکھے اور بغل میں جھاڑو دبائے گلیوں میں سے ایسے گزرتی تھی جیسے ایک سپہ سالار جا رہا ہو سینہ تنا ہوا' گردن اُٹھی ہوئی اور نگاہیں سیدھی...... اس کا پچھلا حصہ بھاری تھا اور تیزی سے ایک دوسری سے ٹکراتی رانیں اس کی چال میں عجب جنسی دل کشی پیدا کر دیتی تھیں۔ کتنے من چلے اسے چھیڑ کر اس سے گالیاں کھا چکے تھے۔ بھنگنوں کی اکثریت کی طرح اس کی آواز میں بھی کرختگی تھی گو جوانی کی وجہ سے یہ کرختگی محسوس نہ ہوتی تھی لیکن عمر ڈھلنے کے ساتھ ہی آواز کی کھنک نے کرختگی میں تبدیل ہو جانا ہے۔

آج تین دنوں بعد اس کی چال میں بگولے والی تیزی نہ تھی بلکہ وہ سر جھکائے

جیسے کسی بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔نوکری آج سر پر کبکلا ہی کے انداز سے نہ دھری تھی بلکہ جھاڑو کے ساتھ اسے بغل میں دبا رکھا تھا۔آج بے باک نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔

وہ سب سے پہلے اس کے گھر گئی اسے پتہ تھا کہ آج اتوار کی چھٹی ہے اور وہ گھر پر ہی ملے گا۔وہ گھر پر ہی تھا۔وہ اس کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔جنتے نے اسے کوٹھے پر آنے کا اشارہ کیا اور وہاں اس نے جلدی جلدی ساری بات سنا دی اور آخر میں بولی ''اب میں کیا کروں؟''

وہ چپ تھا۔وہ گھبرایا ہوا تھا۔وہ پریشان تھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی مگر وہ اس سے آنکھ نہ ملا رہا تھا'' کچھ تو بولو'' وہ تنگ آ کر بولی۔

''تمہارے بھائیوں نے تمہیں کیوں مارا تھا؟''

''وہ مجھ سے تمہارا نام پوچھتے تھے۔''

''کیوں؟''

''تمہارا سر توڑنے کو۔''

اس نے جلدی سے سر کو ایسے چُھوا جیسے اس کا جواب روڑا بن کر اس کے سر پر لگا ہو''کوئی آ رہا ہے۔''وہ گھبرا کر بولا۔

وہ جلدی سے دُوسری سیڑھیوں سے اُتر گیا۔وہ ایک دو لمحہ کو حیران سی کھڑی رہی' کوئی بھی نہ آیا۔اس نے خاموشی سے بیت الخلا صاف کیا اور جب وہ نیچے اتری تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ڈیوڑھی میں اس کا سائیکل نہ تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ باہر چلا گیا ہے۔ اس نے سوچا شاید وہ گلی کی نکڑ پر اس کا انتظار کر رہا ہو گا مگر وہ اسے کہیں بھی نظر نہ آیا......اور پھر اس کے بعد وہ کہیں نہ ملا۔کئی دنوں تک وہ ٹٹو لنے والی نظروں سے گھر کے کمروں اور کوٹھے کو دیکھتی رہی مگر وہ کہیں نہ ملا۔

ایک دن اس نے یوں ہی باتوں باتوں میں گھر کی مالکن سے ذکر چھیڑا تو معلوم ہوا کہ بابو صاحب چھٹیاں گزارنے کے لیے اپنی خالہ کے ہاں کراچی چلے گئے ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی خالہ کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گی۔

جنتے کے ذہن میں جیسے کنکھجورے رینگ رہے تھے اور بچھو ڈنگ مار رہے تھے۔

......اور جنتے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟

جنتے کا اعتماد ختم ہو چکا تھا۔جس کے سہارے پر اُس نے بھائیوں کی مار کھائی تھی جس کے سہارے اب تک اُس نے ان سب کا مقابلہ کیا تھا۔وہ اب وہاں سے غائب ہو چکا تھا اور جنتے اتنی احمق نہ تھی کہ وہ اس کا مطلب نہ سمجھتی۔ دراصل اسے اپنے بابو سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی۔ وہ اس کی میٹھی میٹھی باتوں میں ایسی اُلجھی تھی کہ اب اُس کے لیے انجام تلخ تر تھا۔اس کا تو خیال یہ تھا کہ اس کی مصیبت کا سنتے ہی وہ اسے سینے سے لگا کر اپنے پیار بھرے لہجہ میں تسلی دے گا' وہ اگر اس کے سامنے اپنی مجبوریاں بیان کر دیتا تو جنتے کا پیار اتنا گھمبیر تھا کہ وہ ہر آفت جھیل جاتی لیکن وہ اسے شادی کا وعدہ نہ یاد دلاتی مگر اس کا یہ طرز عمل اس کے کلیجہ میں پھانس بن کر کھٹک رہا تھا۔اس کا بس نہ چلتا تھا ورنہ وہ اسے بھرے بازار میں گریبان سے پکڑ کر اس کے کرتوت دُنیا کو سُنا دیتی۔ وہ اس کے لمبے لمبے بالوں کو مٹھی میں لے کر اپنی جھاڑو سے اس کی وُہ مرمت کرتی کہ وہ ٹرک سے کچلے جانے والے پلے کی طرح چیخ اُٹھتا۔جس طرح اُس کے بھائیوں نے اسے ٹھوکروں سے مارا تھا وہ بھی اسے اسی طرح مارتی اور جب وہ اسے مارتے مارتے تھک جاتی اور وہ بھی نڈھال ہو جاتا تو وہ اسے نالی کے کنارہ پر ایسے ہی پھینک دیتی جیسے اس نے گندی نالی سے کوئی چیز نکال کر اس کے کنارے پر پھینک دی ہو۔

جنتے جب یہ تصور کرتی تو اسے بڑی تسکین ہوتی وہ دیکھتی کہ اس کے گورے جسم پر اس کی ٹھوکروں' جھاڑوؤں اور ناخنوں کے لال لال اور نیلے نیلے نشانات پڑ چکے ہیں' وہ اس سے معافی مانگ رہا ہے وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہے لیکن وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح خونخوار بن چکی ہے۔وہ آہستہ آہستہ اس کا گلا گھونٹتی جاتی ہے' سفید گردن پر اس کی اُنگلیوں کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی ہے اس کی آنکھیں باہر کو اُبلی پڑ رہی ہیں اور ان کی سفیدی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے' اس کے کُھلے منہ سے زبان باہر نکل رہی ہے۔...... کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح۔ وہ کچھ پروا نہیں کرتی' بس اس کا گلا گھونٹے جا رہی ہے اور پھر جیسے اس کے محبوب کی گردن ایک طرف ڈھلک جاتی ہے اور وہ اس کی گردن میں اپنی

انگلیوں کے نشانات پر تھوک دیتی ہے۔

جنتے کے تمام جسم میں کپکپی تھی اور وہ رو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی ماں نے اسے کونے میں بیٹھے روتے دیکھا تو اس نے وہیں سے چلا کر کہا ''کتیا! میں نے کہتی تھی'' مگر جنتے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اُٹھ کر اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ ''تیرا بابو کس دن بارات لے کر آ رہا ہے۔''

جنتے نے آنسوؤں سے تر آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ان میں بے چارگی تھی، ان میں التجا تھی۔ اس کی ماں اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس نے روتی ہوئی جنتے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ''نہ رو میری بچی! نہ رو'' وہ پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی ''نہ میری بچی جنتے'' اس کی ماں کو یہ جنتے وہ ننھی منھی سی جنتے لگ رہی تھی جو باہر سڑکوں پر لڑکوں سے پٹ کر اس کے گھٹنے سے لگ کر رو دیا کرتی تھی۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ جنتے نے اسے روتے روتے سب کچھ بتا دیا۔

''اب کیا ہوگا؟''

اس کی ماں بولی ''گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا؟''

''کیسے؟''

''میں پھاتو سے ملوں گی۔ اس کی ساری عمر ان ہی کاموں میں گزری ہے۔''

پھاتو ایک دائی تھی اور خود جنتے اس کے ہاتھوں کی پیدا کردہ تھی۔ ''وہ کیا کرے گی؟'' جنتے نے گھبرا کر پوچھا۔

''کچھ تو کرے گی'' اس کی ماں پورے وثوق سے بولی ''تمہیں وہ نیلے چبارے والی بیگم یاد ہے نا؟''

''ہاں! وہی خان صاحب کی بیگم؟''

''ہاں! اس کی بھی ایسی گڑبڑ تھی''

''نہیں''

''سچ......'' جنتے کی ماں ایک لمحہ کو یہ بھول گئی کہ وہ اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہے ''وہ اپنے نوکر کے ساتھ پھنسی ہوئی تھی اور پھاتو نے ہی اس کا کام کیا تھا۔ اس نے اسے دو

چار ایسی پڑیاں دیں کہ بس خون میں سب کچھ نکل گیا۔"

"خون" جنتے نے جھرجھری لی۔

"ہاں!" اس کی ماں سرگوشی میں بولی "کپڑوں کا ڈھیر خون سے بھر گیا تھا اور میں نے پھر انہیں باہر لے جا کر پھینکا تھا۔"

"تو نے مجھے نہ بتایا" اس کی بیٹی نے جیسے گلہ کیا۔

"بغیر بتائے ہی یہ حال ہے تو بتانے پر پتہ نہیں کیا ہوتا؟"

ماں بیٹی اسی طرح سر جوڑے باتیں کرتی رہیں۔ اتنے میں بڑا بھائی آیا اس کی ماں اسے کونے میں لے گئی اور اسے سارا قصہ سمجھا دیا اس نے ایک دو مرتبہ اپنی بہن کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب گھر والوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

اسی شام پھاتو آئی۔ اس کی ماں پہلے سے ہی اسے سب کچھ سمجھا چکی تھی۔ اس نے آتے ہی جنتے کے ساتھ چند کاروباری قسم کی باتیں کیں اور اس کے بعد اسے کوٹھڑی میں لے گئی۔ اس کی ماں بھی ساتھ تھی۔ اس نے اسے لٹا کر اس کے پیٹ پر سے کپڑا الٹ دیا اور اِدھر اُدھر سے دبا دبا کر دیکھنے لگی۔

اس نے داہنے حصہ کو دباتے ہوئے کہا "لڑکا ہے۔"

"گولی مار!" اس کی ماں بولی۔

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟" جنتے اپنی حیرت نہ چھپا سکی۔

"یہ اس نل میں ہے" اس نے داہنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بچہ؟" اس نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں!" پھاتو کے مشاق ہاتھ اس کے جسم کو ٹٹول رہے تھے۔ کہیں ہاتھ لگنے سے اسے گدگدی ہوتی تو کہیں سے شرم آتی۔

اچھی طرح دیکھ بھال کے بعد پھاتو نے جنتے کی ماں سے کہا۔

"اسے کونین لا کر کھلا دو"

"کونین؟"

''ہاں۔'' پھاتو نے اسے استعمال کا طریقہ سمجھایا ''اسے دو تین دنوں تک صبح شام کھلاؤ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس رات چھوٹے بھائی نے پھر سے ہنگامہ کھڑا کر دیا اب اُسے ''مجرم'' کے نام کا پتہ چل گیا تھا تو وہ اس کے گھر والوں سے لڑنے مرنے پر تلا بیٹھا تھا لیکن سب نے اسے سمجھایا کہ اول تو اسے وہ کبھی تسلیم ہی نہ کریں گے اور پھر اس کے علاوہ بدنامی بھی تو اپنی تھی۔ ساری عمر برادری میں جنتے پر کوئی تھوکنا بھی پسند نہ کرے گا۔ اس بات سے اس کا غصہ سرد ہو گیا...... اور اس رات وہ کونین کھا کر لیٹ گئی۔

تمام رات اسے نیند نہ آئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے آسمان کو گھورتی رہی۔ اس کے ایک بھائی کے خراٹے گونج رہے تھے۔ اس کی ماں گٹھڑی سی بنی پڑی تھی مگر ایک وہی تھی جو بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کونین کی یہ گولی بلیڈ کی طرح اس کے اندر کسی چیز کی جڑوں کو کاٹ رہی ہے' اسے اپنے معدہ میں بعض اوقات سرسراہٹ سی محسوس ہوتی اور کونین کی خشکی کانوں میں سیٹیاں سی بجا جاتی۔ نصف شب کے قریب اسے کچھ وہم سا ہوا اور اس نے اُٹھ کر شلوار دیکھی مگر کچھ بھی نہ تھا۔ تمام رات اس نے یوں ہی گزار دی اور صبح کو دوسری پڑیا کھا کر مردہ دلی سے ٹوکری اُٹھا کر چل دی۔

دوپہر کو پھاتو آئی اور اسے یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ دونوں پڑیاں بے سود ثابت ہوئیں اس نے خوراک میں اضافہ کر دیا مگر پھر بھی بات نہ بنی۔

کونین کے بعد اس نے ایک دو اور نسخے بھی آزمائے مگر معاملہ وہیں رہا۔

''پھاتو! تیرا کمال بھی دیکھ لیا'' جنتے کی ماں تنگ آ کر بولی۔

اور پھاتو جل کر بولی ''آدمی کا ہوتا تو اب تک صاف ہو چکا ہوتا۔ یہ تو کسی کتے کا لگتا ہے۔''

جنتے نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر اس نے منہ کھول کر پھر بند کر لیا۔ اس وقت پھاتو ہی اسے اس مصیبت سے بچا سکتی تھی اور وہ اس سے بگاڑ پیدا نہ کر سکتی تھی۔

پھاتو نے تمام جتن کیے لیکن اس کی تمام کوششیں بے ثمر رہیں۔

اور اس نے ہار مان لی۔

''جنتے کی ماں'' وہ بولی ''میں کچھ نہیں کر سکتی۔ خدا کے آگے پھاتو بے بس ہے۔ خدا اسے زندہ رکھنا چاہتا ہے ورنہ کونین کی دو خوراکیں ہی کافی تھیں'' اور اس نے کئی ایسی شریف عورتوں کے پھول کھول کر رکھ دیئے جن کے کونین کی ایک دو خوراکوں کی وجہ سے پول نہ کھل سکے۔

''پھر اب کیا ہوگا؟''

''اب تو اس کا اپریشن ہی ہو تو ہو''

''وہ کیسے ہوگا؟''

''وہ تو ڈاکٹر کرتا ہے۔ اس میں خرچ اور خطرہ دونوں ہی ہیں اور ہر ڈاکٹر ایسے کام کی ہمت بھی نہیں کر سکتا۔''

''تو اب؟''

''خدا پر چھوڑ دو...... وہ بہتر ہی کرے گا۔''

''وہ جو کر رہا ہے وہ ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا۔''

پھاتو کے چلے جانے کے بعد جب اس کے بھائیوں کو پتہ چلا کہ اب تو آنے والے کو کوئی نہیں روک سکتا تو ایک مرتبہ پھر بڑا ہنگامہ ہوا۔ نئے سرے سے گالی گلوچ کے بعد جب مار تک نوبت آنے لگی تو اس کی ماں درمیان میں آ گئی۔ کوفت تو اسے بھی بہت تھی لیکن اب وہ ایسی حالت میں اپنی بیٹی کی پٹائی بھی تو برداشت نہ کر سکتی تھی۔ عرصہ کی بک بک جھک جھک کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ جنتے کو اس کی خالہ کے ہاں گاؤں بھیج دیا جائے۔ یہ خالہ بیوہ تھی اور ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ جب تک اُبھار نمایاں نہ ہوا جنتے وہیں رہی لیکن جب اس کی حالت مشکوک ہونے لگی اور ایک دو خرانٹ بوڑھیوں نے اسے چونک کر دیکھا تو ایک دن جنتے کی ماں نے اسے گاڑی میں سوار کرایا اور اپنی بہن کے گاؤں لے آئی۔

گاؤں

گاؤں ایسا بُرا نہ تھا اور عام گاؤں سے کسی لحاظ سے بھی ممتاز نہ تھا...... پیشاب کی دھار جیسی ٹیڑھی ترچھی نالیاں جو وہاں کی ٹیڑھی ترچھی گلیوں کے بیچ میں سے زمانہ بھر کے گند کو لے کر گزرتی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر پڑے گلے سڑے پھلوں جیسے ننگ دھڑنگ بچے

جو دن بھر شور مچاتے پھرتے رہتے' باسی سالن ایسی روکھی پھیکی اور سڑی بسی عورتیں۔ غرضیکہ یہ عام گاؤں جیسا سیدھا سادا گاؤں ہی تھا۔

جنتے کی خالہ گاؤں کے کنارے ایک ایسے شکستہ مکان میں رہتی تھی جو کوڑے کی لاوارث ڈھیری کی طرح بے توجہی کا شکار تھا۔ تنہا رہتی تھی اور بڑی ہی کٹنی تھی۔ اس کا سر چھوٹا سا تھا' جسم بے حد پتلا دبلا تھا آستینوں میں سے نکلے ہوئے سوکھے بازوؤں کی وجہ سے وہ نقلی چوکیدار کی بہن لگتی تھی۔ اس کے سوکھے ہوئے چہرے پر دو پپڑائے ہوئے ہونٹ تھے اوران ہونٹوں کے درمیان ایک پتلی سی زبان تھی جو ہر وقت چلنا پسند کرتی تھی' اپنے حلیہ اورزبان کی وجہ سے جنتے کو وہ کالی مرچ لگی۔ چھوٹی اور سیاہ مگر بے حد تیز!

اس نے جنتے کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ گاؤں کے چند گھروں میں تھوڑا سا کام کر کے آتی تو جنتے کے سر پر سوار ہو جاتی۔ اسے بہت سے مفید مشورے دیے جاتے بہت سی نیک ہدایات دی جاتیں اور بہت سی اونچ نیچ سمجھائی جاتی۔ اس نے حمل ضائع کرنے کے لیے اپنے زریں مشاہدات کی روشنی میں کچھ نسخے اور ترکیبیں بھی بتائیں جنہیں جنتے نے ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

گھر میں وہ دونوں ہی ہوتی تھیں اور آج کل ان کے درمیان ایک ہی مسئلہ رہ گیا تھا۔ ایک دن اس کی خالہ نے پوچھا ''تم جو اتنے اطمینان سے وقت گزار رہی ہو۔ جب وہ پیدا ہوا تو پھر اس کا کیا کرو گی؟''

''یہ اسی وقت دیکھا جائے گا''

''اگر پہلے سے کچھ سوچا نہیں تو پھر اس وقت کیا دیکھو گی''

''میں نے ابھی تک کچھ نہیں سوچا اور نہ میں سوچنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں؟'' خالہ بولی ''تم نہ سوچو گی تو اور کون سوچے گا''

مگر جنتے نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اس نے جو سوچنا تھا وہ تو عرصہ سے سوچ چکی تھی اور اس بڑھیا کو بتانے سے کیا فائدہ! مگر بڑھیا کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی ''کسی کو دے دو گی؟''

''تم لے لو گی؟'' وہ جل کر بولی۔

''میں ...... میں کیسے لے سکتی ہوں۔''

''کیوں؟''

''میں اکیلی بوڑھی جان ...... میں اسے کیسے سنبھال لوں گی۔''

''اس معاملہ میں سبھی بوڑھی جانیں نکلتے ہیں۔''

''یہ تو ضروری نہیں ...... اور اگر تم چاہو تو میں کسی کو دلوا بھی سکتی ہوں''

''نہیں! میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دے سکتی!''

اس کی خالہ ایک دو لمحات کو اس کی طرف دیکھتی رہی۔ تعجب سے نہیں بلکہ دلچسپی سے ...... اس کی آنکھوں میں تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی۔

جنتے کو آگ لگ گئی مگر وہ خاموش رہی۔ بڑھیا پھر بولی ''تم نے ضرور اس بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''نہیں ...... ویسے میں سوچتی ہوں شاید وہ مرا ہوا پیدا ہو یا اسے نمونیہ ہی ہو جائے یا۔''

خالہ کے پپڑائے ہوئے ہونٹوں سے خارج ہونے والا قہقہہ جنتے کو گندی نالی میں پھدکتے ہوئے مینڈک جیسا کراہت انگیز محسوس ہوا ''اری پگلی!'' وہ ہنسی روک کر بولی ''حرامی اتنی جلدی پیچھا نہیں چھوڑا کرتے۔''

جواب میں جنتے اٹھ کر چلی آئی۔

جنتے ایک تو اپنی حالت سے تنگ تھی ادھر یہ بڑھیا اب سلگتی لکڑی کے کسیلے دھوئیں جیسی ہو تھی اور یوں وہ خود کو چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان پستی محسوس کر رہی تھی۔

جسمانی طور سے گو اس کی حالت اب خراب سے خراب تو ہوتی جا رہی تھی لیکن اسے ذہنی سکون میسر آ چکا تھا کیونکہ اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بدنامی کے اس داغ اور ذلت کے اس نشان کا وجود ختم کر دے گی۔

ادھر ہر آنے والا دن اس کے لیے کوئی نہ کوئی آفت ہی لے کر آتا تھا۔ سر کا چکرانا اور دل کا متلانا تو معمولی سی چیز تھی ان کے علاوہ وقت بے وقت کے الٹے سیدھے درد تھے اور ویسے بھی ان دردوں کے بغیر بھی وہ خود کو مٹی کے ایک ڈھیر کی طرح محسوس کرتی تھی۔

ہر وقت چت لیٹی پنڈلیوں پر سے شلوار ہٹائے وہ ٹانگیں ہلاتی رہتی۔ ادھر صندلیں چھاتیاں آبنوسی ہوتی جا رہی تھیں اور ان کے سرے جو لوہے جیسے تھے اب وہ سوجے سوجے سے تھے اور اگر وہ ہاتھ سے دبا کر دیکھتی تو ان میں کیلوں کی تکلیف وہ چبھن ہوتی۔

کچھ عرصہ سے بچہ نے ''حرکت'' بھی شروع کر دی تھی۔ اس کی خالہ ہر نئی تبدیلی کا دلچسپی اور شوق سے مطالعہ کرتی اور پھر اس پر تبصرہ کرتی...... ایک دن اس نے جنتے کو زبردستی لٹا دیا اور اس کے پیٹ کی گولائی کو مختلف مقامات سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھتی رہی اور آخر میں فیصلہ صادر کیا ''یہ بچہ بہت تندرست ہے'' پھر ایک وقفہ سے بولی۔ ''ایسے بچے بہت تندرست ہوتے ہیں۔''

جنتے نے اب اس کی باتوں کو خاموشی سے سننے کی عادت بنا لی تھی۔

ادھر جنتے میں آہستہ آہستہ ایک اور ذہنی تبدیلی پیدا ہوتی جا رہی تھی شروع شروع میں اسے ذرا بھی تکلیف ہوتی تو وہ ''اسے'' کوستی بد دعائیں دیتی اور گالیاں نکالتی۔ اس کے بعد یہ غم و غصہ اس کی اپنی ذات کی طرف منتقل ہو گیا لیکن اب بڑھتے دنوں کے ساتھ جیسے جیسے اس کی تکلیفوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے ہی اس کی نفرت اس بچہ سے وابستہ ہوتی جاتی۔ جب وہ اس کی حرکت محسوس کرتی تو حرکت کے مرکز سے اس کے تمام جسم میں گویا نفرت اور کراہت کی لہریں پھیل جاتیں۔ غصے سے اس کا خون کھول جاتا۔ اگر اپنی موت کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ پیٹ میں چاقو مار کر اسے ختم کر دیتی۔

اس نے کئی ایسے خواب دیکھے تھے جن میں اس نے بچے کا گلا گھونٹ کر اسے مارا تھا۔

بے شمار راتیں ایسی آئی تھیں جب اس نے کسی ناگن کی مانند بس گھولتے گھولتے ہی رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

ادھر وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی

اور پھر وہ دن بھی آ گیا!

خوف اور دہشت سے اس کی بری حالت تھی۔ اس کی ماں کوئی پندرہ دن پہلے سے آ چکی تھی۔ ایک دائی بھی موجود تھی۔

درد تھا کہ لہروں کی صورت میں بڑھتا اور وہ اپنے جسم کو درد کی ان تیز لہروں پر ایک بے بس تنکے کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ درد کے احساس کو دبانے کے لیے اس نے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا رکھا تھا اور ان دانتوں نے اس کے ہونٹوں میں گڑ کر خون نکال دیا تھا۔

رات کا وقت تھا کمرہ میں ایک طاق پر ایک ڈیوٹ دھواں بھری روشنی دے رہا تھا۔

جب درد نا قابل برداشت ہو گیا تو پہلے اس نے کراہنا اور بعد میں چیخنا شروع کر دیا۔ ایک دو موقعوں پر اس نے بچے کے باپ اور بچے کو بھی گالیاں نکالیں۔

دائی اس کی ٹانگوں کے پاس بیٹھی نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ اس کے ذہن پر جیسے افیون کا غبار چھا رہا تھا...... اور پھر درد کا ایک شدید جھٹکا۔ جان نکال لینے والی ایک اور لہر اور پھر......

وہ بے ہوش پڑی تھی!

جب اس کی آنکھیں کھلیں تو وہ اب بھی درد محسوس کر رہی تھی مگر اب لہروں والی کیفیت نہ تھی بلکہ اب بہتی نالی کی طرح درد ایک ہی رفتار سے جاری تھا

اس کی ماں نے اس کے پاس آ کر کہا "بیٹی ہے۔"

"زندہ؟" اس نے بے ساختگی سے پوچھا۔

"ہاں!" پتہ نہیں یہ کراہ درد کی وجہ سے تھی یا بچی کے زندہ ہونے کا سُن کر وہ کراہی تھی۔

"دیکھو گی؟" اس کی خالہ نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے منہ پھیر کر کہا۔

"کیوں؟"

"میں اس مردار کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"مگر اسے تو تمہارے ساتھ ہی سلانا ہے۔"

"میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی"

دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھا اور چپ ہو

رہیں۔ دایہ چہرے پر حماقت کے آثار لیے یہ سب گفتگو سنتی رہی۔ بیٹی کی وجہ سے دائی بھی کوئی خاص خوش نہ تھی۔ بہرحال وہ گڑ اور آٹا لے کر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

اس رات بچی نانی کے ساتھ سوئی۔ اسے جنتے کی ضد کا علم تھا وہ اس کے غصہ سے بھی واقف تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اسے ذرا بھی چھیڑا گیا تو وہ واقعی اس کا گلا گھونٹ دے گی۔ اس نے بچی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوچ رکھی تھی ایک ایسی عورت تھی جو اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھنے کو تیار تھی۔

تین چار دن گزر گئے ابھی تک بچی نانی کے ساتھ ہی سوتی تھی۔ جنتے کی چھاتیوں میں ابھی دودھ نہ اترا تھا۔ اور اگر اُترا بھی ہوتا تو وہ شاید اسے پلانا پسند نہ کرتی۔ وہ اسے روتے سنتی تو اس کا تن بدن سلگ اٹھتا ابھی تک اس نے اس کی صورت نہ دیکھی تھی اور نہ ہی کبھی یہ پوچھا تھا کہ دودھ کے بغیر اس کا گزارہ کیسے ہو رہا ہے۔

چھٹے دن وہ خود میں اتنی جسمانی طاقت محسوس کر رہی تھی کہ اپنے منصوبے پر عمل کر سکے۔ اُس نے رات کو خاموشی سے سوتی ہوئی بچی کو اُٹھایا وہ کھیس کے ایک ٹکڑے میں لپٹی تھی۔ ایک لمحہ کو بچی پر اس کی نظر گڑی کی گڑی رہ گئی۔ سانولی اور گول مول بچی بالکل جنتے تھی۔ دوسرے لمحہ اس نے دروازہ کھولا اور وہ گھر سے باہر تھی۔ بچی پھینکنے کے لیے اُس نے ایک اچھی جگہ کا انتخاب کر رکھا تھا جہاں وہ صبح تک اکڑ کر مر سکتی تھی۔ گاؤں کے لوگ اُس طرف کم ہی جاتے تھے۔ دریا کی ناہموار جگہ میں اس نے پہلے ہی سے ایک گڑھے کا انتخاب کر رکھا تھا۔ بچہ کو اس گڑھے میں رکھنے کے بعد اس پر ٹہنیوں اور پتوں کا ڈھیر رکھ دینے سے کام ختم!

بچی ایک نرم اور گرم گٹھڑی بنی اس کے بازوؤں میں تھی۔ کمزوری کی بنا پر وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اسے یہی ڈر تھا کہ کہیں بچی اس دوران میں رونا نہ شروع کر دے اور کوئی اس کی آواز نہ سن لے۔

اب جب کہ وہ بچی سے چھٹکارا حاصل کرنے والی تھی تو اس کا ذہن بالکل صاف تھا اب وہاں تلخی اور غم و غصہ نہ تھا۔ اس نے بچی اور اس کے باپ دونوں ہی کو معاف کر دیا تھا۔

اسے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحہ کو اُسے خیال آیا کہ اس سردی میں بچی کو

ٹھنڈ تو بہت لگے گی لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے سوچا میرا مقصد تو اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ سردی سے مرے یا گرمی سے...... مجھے اس سے کیا۔

ادھر اس کی طاقت بھی جواب دے رہی تھی اور درد دوبارہ شروع ہو گیا تھا لیکن اس نے چلنا جاری رکھا اور بالآخر وہ منزل تک جا ہی پہنچی۔

اس نے گڑھے میں بچی کو رکھا اور پھر اس کے اوپر ٹہنیاں رکھنے ہی والی تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی چلا آ رہا ہے اس کا دل دھک سے رہ گیا اور اس ٹھنڈ میں بھی اسے پسینہ آ گیا۔ وہ بچی کو اسی طرح چھوڑ کر بھاگی لیکن چند قدم کے بعد ایک دم رک گئی۔ کسی کے آنے کی آواز تو اس کا وہم ہی نکلی لیکن یہ دوسری آواز اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رہی تھیں۔

......اس کی بیٹی رو رہی تھی!......اس کے قدم من من کے ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے جسم کو آگے کی طرف گھسیٹنا چاہا۔ مگر بچی کے رونے کی تیز آواز جیسے اس کے پاؤں میں میخیں گاڑ چکی تھی۔

وہ دیوانہ وار بھاگی اور دوسرے لمحہ ماں بیٹی کو سینے سے لگائے رو رہی تھی۔

کاٹھ کی عورتیں

جب گاڑی چلنے لگی تو میں تو ضبط کیے رہا مگر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے شاید خُدا حافظ کہنے کو منہ کھولنا چاہا مگر ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی۔ یوں لگا جیسے وہ سرکتی ہوئی گاڑی کے ساتھ کچھ دیر چلے گی اس نے ہاتھ ہلایا اور پھر آنچل میں منہ چُھپا لیا۔ جب میں نے کھڑکی میں سے سر اندر کیا تو بھیگی آنکھوں نے جیسے تمام سواریوں کو رنگ برنگ دھبوں میں تبدیل کر دیا۔ میں نے سر جھٹک کر آنکھوں کو صاف کیا تو مقابل کا دھبہ ایک عورت میں تبدیل ہو گیا۔ وہ دلچسپی سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی آنکھیں چار ہونے پر وہ مسکرا دی۔ میں نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا جہاں لاہور کے کچے پکے مکان شریک سفر نظر آئے۔

''تمہاری پسند بہت اچھی ہے۔''

میں نے ہڑ بڑا کر دیکھا تو وہ مسکرا دی اور اب میں نے پہلی مرتبہ اُسے خشک آنکھوں سے دیکھا' وہ پچاس سے کم نہ ہو گی۔ بیضوی چہرہ کا نمک دوشیزگی میں سخت کافر ہو گا اور آنکھوں کے مسکراتے بھنور میں نہ جانے کتنے دل ڈوبے ہوں گے مگر اُس کی گونجیلی آواز سر کی چاندی سے میل نہ کھاتی تھی یہ وہ خاص ہسکی آواز تھی جو امریکہ میں سیکسی بلونڈ سے مخصوص سمجھی جاتی ہے۔

اُس نے مجھے چکرا دیا تھا اسے کیا جواب دوں! بات اس کی غلط نہ تھی کہ میری پسند لاکھوں میں ایک تھی۔ میں نے اُسے پلکیں جھپکا کر دیکھا وہ پھر اسی شگفتہ

لہجہ میں بولی۔

’’میں تم دونوں کو بہت دیر سے دیکھ رہی تھی‘‘

یقیناً یہ کوئی چالاک بڑھیا ہے میں نے سوچا اور سفر میں تو طرح طرح کے کیریکٹر ملتے رہتے ہیں میں نے کہا۔

’’آپ نے ہماری باتیں بھی سُن لی ہوں گی۔‘‘

وہ ہنسی ’’نہیں! مگر بغیر سُنے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہوگے۔‘‘

میں نے اس کا مسکراتا چہرہ دیکھا تو وہاں کٹنیوں جیسی وہ مکاری نظر نہ آئی جو بعض بوڑھی عورتوں میں پائی جاتی ہے' نہ ہی اُس کی آنکھوں میں وہ سلگتی راکھ تھی جو نوجوانوں سے بات کرتے وقت بعض ٹھرکی بوڑھیوں میں نظر آتی ہے! تب میں نے پہلی رائے میں ترمیم کرتے ہوئے سوچا یہ چالاک نہیں محض خوش مزاج ہے۔ آمنے سامنے والی سنگل سیٹ پر ہم تنہا تھے شاید یہ سفر کی اکتاہٹ باتوں سے دور کرنا چاہتی ہے اور ہوسکتا ہے یہ محض باتونی ہو لیکن ایک بات تھی کہ اس نے موضوع ایسا چھیڑا تھا کہ دل رانجھا بن کر ونجلی کی تان پر جھوم اُٹھا۔ میں طبعاً باتونی نہیں اور بالخصوص دورانِ سفر مجھے ملکی سیاست' اقتصادی حالات اور یہ کہ اگر ہم سب پکے مسلمان بن جائیں تو ہمارے تمام مسائل حل ہوسکتے ہیں۔ جیسے موضوعات پر اجنبی لوگوں سے بحث مباحثہ کا کوئی شوق نہیں اسی لئے میں نے زیادہ پیسے دے کر قلی سے کھڑکی کے ساتھ والی سنگل سیٹ کا معاملہ طے کیا تھا۔

میرے منع کرنے کے باوجود بھی ہما مجھے چھوڑنے آئی تھی اور اس لیے میں قدرے نروس بھی تھا کہ اگر کسی جان پہچان والے نے دیکھ لیا تو مصیبت آجائے گی۔ میں پہلی مرتبہ لاہور چھوڑ کر کراچی جا رہا تھا وہ میرے پاس کھوئی کھوئی سی کھڑی تھی میں اس کے دل کا بوجھ دور کرنے کو زور شور سے بولتا رہا پھر اُسے گم دیکھ کر خود بھی گم ہوگیا تب میری پریشانی دور کرنے کو اس نے باتیں شروع کردیں۔ تسلی کی باتیں خط لکھنے کی باتیں' انتظار کی باتیں!

میں طبعاً باتونی نہیں اور نہ ہی آسانی سے ہر ایک کو راز دار بنالیتا ہوں مگر اس نے کچھ اس ڈھب سے گفتگو شروع کی کہ تھوڑی دیر بعد میں نے خود کو اُسے تمام باتیں بتاتے پایا۔ ہمارے محبت اُلجھنیں' مسائل اور اب ملازمت کی وجہ سے کراچی جانا۔ میں گفتار کا غازی نہیں مگر وہ گوش ہمدرد ثابت ہوئی اور میں نے دل کا بستہ کھول دیا۔

''بیٹا! سنجوگ مقدر کی بات ہے۔''

ہم دونوں خاموش تھے' سب کچھ بتا کر میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا وہ جیسے سوچ سمندر کی تہہ میں تھی۔ باہر درخت کھیت اور بجلی کے کھمبے بھاگے جا رہے تھے اندر مارشل لاء اسلام اور جمہوریت کی باتیں تھیں۔ میں نے باہر اور اندر کے مناظر کی یکسانیت سے اُکتا کر نظریں اس کے چہرہ پر مرکوز کر دیں تو اس کے مہربان چہرہ پر نیا رنگ آتا محسوس کیا۔ سانولا چہرہ بتدریج گلابی ہو رہا تھا اس نے گردن کو ایک طرف جھٹک کر جیسے کسی خیال کا دامن جھٹکا اور جیسے آنکھوں کی سیاہی میں دیپ جل اُٹھے وہ شاید کسی خفیہ سوچ کا مزا لے رہی تھی کہ مسکراہٹ کا انداز بدل گیا۔

''سنجوگ مقدر کی بات ہے''

اس نے جیسے فقرہ دہرا کر خود کو قائل کیا۔ ''میں تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سُناتی ہوں تم نے ساہیوال تو نہیں اُترنا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''بعض اوقات شادی یوں ہو جاتی ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کیا تم یقین کرو گے کہ ایک لڑکی گھر سے میلہ دیکھنے نکلی' وہاں ایک مرد کو دیکھا اور اس کے ایک اشارے پر اس کے ساتھ چل دی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے بے اعتباری سے کہا۔

''ہمیشہ تو نہیں کبھی کبھی تو ہو سکتا ہے' نہیں؟''

''شاید''

''دراصل بعض مردوں میں کچھ ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ آنکھ کے ایک اشارے سے اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔''

میں نے ہنس کر کہا ''اور عورتوں کی تاثیر کے بارے میں کیا خیال ہے۔''

''یہ تو تم جانو''

میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ ''آپ کی بات درست ہے لیکن اتنا ہے کہ ایسے مرد یا عورت سب کو غلام تو نہیں بنا سکتے ہاں! انہیں ضرور غلام بنا سکتے ہیں جو غلام بننا چاہتے ہوں۔''

اس نے لمحہ بھر کو سوچا ''غالباً یہ بات ہی دُرست ہو گی جس طرح کچھ لوگ آقا بن کر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ پیدائشی غلام ہوتے ہیں ورنہ ہنسی خوشی اپنے آقاؤں کے اشاروں پر نہ ناچیں اور نہ ہی ان کے تلوے چاٹ کر خوش ہوں۔''

گاڑی کسی اسٹیشن میں داخل ہو رہی تھی اور مسلسل لائنیں بدلے جا رہی تھی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں'' وہ اپنے خیال سے چونکی ''بھئی ہونا کیا تھا وہ اُسے گھر لے گیا''

''یہ تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اپنے گھر لے گیا ہو گا مگر یہ سب ہوا کیسے؟''

''میلے میں لڑکی نے اُسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی'' وہ جھرجھری لے کر بولی ''کچھ عجب ٹونا تھا اُس کی آنکھوں میں۔ اس کے جسم سے کوئی خاص قسم کی مہک آ رہی تھی بس عجیب تھا وہ مرد'' اس کا ماتھا پسینہ میں بھیگ گیا تھا جسے اُس نے سیاہ شال سے پونچھا۔ سردی میں پسینہ؟

ہم دونوں خاموش تھے اور گاڑی متوازی پٹڑیوں پر ناک کی سیدھ میں بھاگی جا رہی تھی۔

وہ بولی ''بعض مرد ایسے ہوتے ہیں گویا ان کے کئی ہاتھ ہوں کئی آنکھیں ہوں اور کئی زبانیں ہوں'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور پھر گویا اپنے آپ سے بولی۔ ''جادو کے درخت ہوتے ہیں ایسے مرد'' اس نے گردن اندر کی تو آنکھیں مجھ سے چار ہوئیں ''ایسا درخت کہ جو پنچھی بیٹھا پھر اُڑ نہ سکا وہ درخت ہی پنجرہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔''

''کمال ہے'' اس کی باتیں مجھے تو سمجھ میں نہ آ رہی تھیں اس لیے یوں ہی بات کرنے کو بولا۔ ''میں نے سانپ کے بارے میں تو سُنا ہے کہ وہ سو سال کا ہو کر جب انسان کی جون میں آ جاتا ہے تو بڑا پرکشش ہو جاتا ہے۔''

''نہیں'' وہ تیزی سے بولی۔ ''اس کی آنکھیں گول نہ تھیں۔''

''تب تو بڑی عجیب بات ہے۔''

''ہاں'' وہ پُرخیال انداز میں بولی۔ ''واقعی عجیب بات ہے اب دیکھو نا ایک لڑکی بھرے گھر سے سہیلیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے آتی ہے وہاں اُسے ایک مرد ملتا ہے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور پھر وہ اس کے ایک اشارے پر اس کے ساتھ چل دیتی ہے۔''

''وہ سُنا ہے کہ بعض مردوں کے پاس گیدڑ سنگھی ہوتی ہے۔''

وہ ہنسی ''گیدڑ سنگھی کوئی چیز نہیں بس یوں سمجھو کہ بعض مرد ہی گیدڑ سنگھی ہوتے ہیں۔''

''ایسا تو بس فلموں ہی میں ہو سکتا ہے۔''

''بس یہی سمجھ لو۔''

''پھر'' میں نے مارے اشتیاق کے پوچھا ''دونوں کی خوب مزے سے بسر ہوئی ہوگی''

''مزا'' اس نے یوں دُہرایا گویا وہ اس لفظ کا ذائقہ محسوس کر رہی ہو۔ ''مزا...... ہاں ایک مزا تو تھا'' وہ بالآخر بولی۔ اب تک کی گفتگو مجھے تذبذب کے اس مقام پر لے آئی تھی کہ یہ سب مجھے بے حد عجیب محسوس ہو رہا تھا کہیں یہ کوئی شرارتی بڑھیا تو نہیں جو مجھے بے وقوف بنا کر اپنا سفر پُرلطف بنا رہی ہے مگر جب اُسے دیکھا تو اس کے چہرہ پر رنگوں کی جوالا دہک رہی تھی وہ جیسے خود کو سمجھا رہی تھی ''مزا...... مزا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''اب دیکھو نا وہ مرد جب اس بے وقوف لڑکی کو اپنے گھر لے آیا تو وہاں پہلے سے تین اور موجود تھیں۔''

''نہیں''

''ہاں اور وہ تینوں بے حد بصورت تھیں شاید اس چوتھی سے بھی زیادہ!''

''تو اس چوتھی نے کیا کیا''

''کیا کرنا تھا اس چوتھی نے......''

''وہ اپنے گھر واپس جا سکتی تھی۔''

''گھر کیسے جا سکتی تھی؟ اور پھر جس کے لیے گھر چھوڑا تھا اُسے چھوڑ کر گھر واپس کیسے جا سکتی تھی۔''

''مگر کیوں نہیں......ایک نہ دو پوری تین سوتیں۔''

''نہیں بھئی۔ وہ نہیں جا سکتی تھی'' اُس نے جیسے کسی ضدی بچے کو چمکارا۔

''آخر کیوں؟''

وہ نظریں جھکا کر اس آہستگی سے بولی کہ الفاظ ریل کے شور کا حصہ بن گئے۔

''اُسے' اُسے اس مرد کی عادت ہوگئی تھی۔ نشہ ہوگیا تھا اس مرد کا!''

''......اور......اور وہ باقی عورتیں۔''

''ان کی بُوٹی بھی وہ مرد تھا' وہ بھی اس سے آزاد نہیں ہو سکتی تھیں۔''

میں نے اُسے دیکھا مگر وہ آنکھیں جھکائے جیسے اپنی کہانی کے سحر کی اسیر ہو چکی تھی۔ تب اچانک اس خیال نے مجھے سُن کر دیا یقیناً یہ بڑھیا کسی پاگل خانہ سے فرار ہوئی ہے اور یہ اپنے جنون کے کسی لمحہ کی فینٹسی سے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل بنا رہی ہے۔ میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر اس کی آنکھوں میں جھانکا مگر وہاں وحشت کی چمک کی بجائے ایسی کیفیت تھی کہ میں اُسے سمجھ نہ پایا وہ بولی'' وہ چاروں اس مرد کی ڈور سے بندھی تھیں اس لیے آپس میں لڑنے مرنے کی بجائے ان میں سگی بہنوں سے بھی زیادہ پیار تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''دراصل وہ بڑا زہریلا مرد تھا سب کو ڈستا تھا۔''

''تو اس کی کوئی پسندیدہ بھی تو......''

''وہ سب کو جوتی میں دال کھلاتا تھا۔''

''مگر کیوں؟ انہوں نے اس کے لیے گھر بار چھوڑا! اپنے ماں باپ بھائی بہن......''

وہ بات کاٹ کر بولی ''میں نے کہا نا کہ وہ بڑا زہریلا مرد تھا جس طرح وہ عورتیں اس کے زہر کا نشہ کرتی تھیں اسی طرح وہ بھی اپنے زہر کے نشہ میں مست تھا۔ گالیاں دیتا' گندی اور بڑی بڑی' تھپڑ مارتا اتنے کہ منہ سجا دیتا' جوتے مارتا' گھر سے نکال دیتا مگر وہ پاؤں پر گر کر معافی مانگتیں۔'' وہ لمحہ بھر کر خاموش ہوگئی۔ ''وہ واقعی اُسے نہ چھوڑ سکتی تھیں۔ وہ انہیں تکلیف دینے اور ذلیل کرنے کے لیے نت نئے طریقے سوچتا رہتا۔'' وہ اچانک رک گئی اس کے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی چہرہ سے جیسے رنگ نچڑتا جا رہا تھا اب جو بولی تو آواز میں عجب لرزش تھی۔

''ایک مرتبہ اس نے چاروں کو یہ سزا دی کہ ان چاروں کی ہتھیلیوں پر چارپائی کے پائے رکھ کر رات بھر سوتا رہا۔''

میں احمقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھ رہا تھا۔

''شاید تمہیں یقین نہ آئے مگر یہ سچ ہے۔ سوں رب دی!''

''مگر انہوں نے......ان عورتوں نے کچھ نہ کہا؟''

''وہ اس ڈر سے نہ چیخیں کہ کہیں اس کی نیند نہ خراب ہو جائے۔''

''پھر؟''

''پھر کچھ نہ ہوا۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ مر گیا''

''مر گیا!......مگر کیسے؟''

''بس ایک صبح وہ مردہ تھا۔''

''مگر کیسے مرا وہ؟''

''لوگوں کا خیال تھا کہ اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اُوپر سے اتنا دبایا گیا کہ وہ مر گیا۔'' اس کے مرنے کا سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی'' ''اُن کا کیا بنا؟''

''اگرچہ ان چاروں میں بہت زیادہ پیار تھا مگر وہ جس ڈور سے بندھی تھیں وہ اب ٹوٹ چکی تھی لہٰذا قُلُوں کے بعد سب تتر بتر ہوگئیں۔''

گاڑی لائنیں بدلتی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی اور پھر ساہیوال کے طویل پلیٹ فارم پر جا رُکی۔

''اچھا بیٹا! خدا حافظ'' اس نے شفقت سے مجھے دیکھا۔ ''خدا تمہیں کامیاب کرے۔''

اس نے اپنے سامان کی طرف اشارہ کیا اور قلی نے سامان اٹھالیا وہ چادر میں لپٹی اتری اور پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہوگئی۔

ساہیوال بہت پیچھے رہ گیا تھا مگر میں ابھی تک اس ناقابلِ یقین کہانی کی کڑیوں میں گرفتار تھا۔ کیا ایسا ظالم مرد بھی ہوسکتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کیا ایسے ایسے ظلم سہنے والی عورتیں بھی ہوسکتی ہیں؟ اور تب اچانک مجھے اپنی ممانی یاد آ گئی۔ جس نے ظلم سہنے کی حد کر رکھی تھی۔ خاندان بھر میں ہمارے ماموں جلالی ماموں کے نام سے مشہور تھے۔ وہ زبان اور ہاتھ دونوں کے استعمال میں بے دھڑک تھے اور بے چاری چڑیا جیسی ممانی ہر وقت سہمی کانپتی رہتی۔ مستقل خوف سے جنم لینے والے تناؤ نے اس کے چہرہ سے سکون مسکراہٹ اور چمک سب چھین لی تھی اب وہ محض ہڈیوں پر چپکا ہوا گوشت تھی۔ کپڑے پہنتی تو لگتا ہینگر پر لٹکے ہیں آج تک کوئی یہ بھید نہ جان سکا کہ اس شریف' سلیقہ شعار' ہمدرد اور نرم مزاج بیوی کو ہمارے ماموں کس جرم کی سزا دے رہے تھے شاید اس لیے کہ وہ بچہ نہ دے سکی۔ مگر یہ کوئی اتنا قبیح جرم تو نہ تھا۔

اور میں اسی جلالی ماموں کے گھر رہنے جا رہا تھا!

ممانی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر وہ اتنی ناخوش رہی تھی کہ اب وہ ڈھنگ سے خوشی کے اظہار پر بھی قادر نہ تھی۔ وہ مجھے کاٹھ کی عورت لگی بلکہ وہ چاروں سوتیں بھی کاٹھ کی عورتیں ہی تھیں جبھی خاموشی سے سب کچھ سہہ گئیں اور اس لیے ممانی بھی سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔

''ماموں کا کیا حال ہے؟''

''ویسے ہی ہیں۔''

وہ مجھے ماموں کے کمرے میں لے گئی جلالی ماموں اب محض مفلوج ماموں تھے۔

''یہ صرف سُن سکتے ہیں۔'' ممانی مجھے بتا رہی تھی ''ہاں کہنی ہو تو ایک مرتبہ پلکیں جھپکاتے ہیں نہ کہنی ہو تو دو مرتبہ'' وہ زور سے بولی ''تمہارا بھانجا آیا ہے۔''

ماموں نے ایک مرتبہ پلکیں جھپکا دیں۔

جلالی ماموں کا بے حد خوبصورت جسم اب مردہ گوشت کی طرح گھن پیدا کر رہا تھا۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر بہت افسوس ہوا ''کوئی افاقہ کی صورت نہیں۔''

''بظاہر تو نہیں'' وہ بولیں ''ہسپتال والوں نے فارغ کر دیا ہے کہ یہ لمبا کام ہے اب تو میں ہی علاج کرتی ہوں بلکہ انجکشن لگانا بھی سیکھ لیا ہے'' ممانی کی آواز میں خدمت کا فخر تھا۔

''کوئی نرس رکھ لیتیں۔''

''پرائیویٹ نرس بہت مہنگی پڑتی۔ اب تو میں نے اُنہیں سنبھال لیا ہے۔''

کھانا کھا کر لیٹا تو تھکن کے باوجود نیند کوسوں دور تھی۔ کاٹھ کی یہ عجیب عورتیں میرے دماغ سے نہ نکل رہی تھیں۔ ممانی نے عمر بھی ذلت کی زندگی بسر کی اور اب بھی اس جلاد کی خدمت میں مگن ہے بلکہ اس خدمت سے وہ مجھے مطمئن اور خوش بھی نظر آ رہی تھی۔

ابھی مجھے اُونگھ ہی آئی تھی کہ ممانی کی آواز سے چونک گیا وہ جیسے غصہ میں بول رہی ہو۔ اتنی رات گئے یہ کس سے لڑ رہی ہے میں اٹھا تو ماموں کے کمرہ میں روشنی دیکھی۔

جس عورت کو کسی نے بولتے نہ دیکھا تھا اُسے میں نے پہلی مرتبہ غصہ بلکہ غیض و غضب کے عالم میں دیکھا۔

''حرام زادے، کمینے، ذلیل، کتے......'' وہ اپنے جلالی خاوند سے مخاطب تھی ''تو نے ساری عمر مجھے جلایا! ذلیل کیا، ظلم توڑے۔ ہاں! اب کیا مردہ مثال پڑا ہے۔ کتے! کہاں گئی تیری اکڑفوں اور تیرا طنطنہ!'' جلالی ماموں پلکیں جھپکائے بغیر اُسے دیکھ رہے تھے۔ جلالی ماموں کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی جب کہ ممانی کی آنکھوں

میں وحشت خالص وحشت۔

اور پھر گالیاں دیتے دیتے اس نے ایک جھٹکے سے جسم پر سے کمبل الگ کر دیا اب وہ اس کے مفلوج پاؤں کے تلوں پر دیوانہ وار قمچیاں برسا رہی تھی اور جلالی ماموں جس انداز سے پلکیں جھپک رہے تھے کسی ذی روح نے آج تک اس طرح پلکیں نہ جھپکی ہوں گی۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

گندہ خون

''جاگیرداری؟'' بڑے خان صاحب نے اس لفظ کو یوں تھوکا جیسے زبان پر کوئلہ رکھ دیا گیا ہو۔ وہ چھڑی جواب تک فضا میں قوسیں بنا رہی تھی ایک لمحہ کو جیسے ساکت ہو کر رہ گئی۔ ''جاگیرداری!'' اس مرتبہ یہ لفظ طنز بن کر منہ سے نکلا۔ ''جاگیرداری''

شام کے سمندر میں پرندے پروں کے چپوؤں سے وجود کی نیا کھیتے جا رہے تھے۔ پھیلتے سائے گندم کے سنہری رنگ میں جو سیاہی گھول رہے تھے اس میں پگڈنڈیوں کی انگلیاں پھیلی تھیں۔ دن بھر چلتے رہنے والے رہٹ کی ٹنڈیں مردہ سانپ کی مانند کوئیں میں لٹکی تھیں۔ کوئیں کے مدار پر گردش کرنے والے بیل سکون سے بیٹھے تھے ایک نے کان ہلایا تو گھنٹیوں سے خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ہم سیر کرتے ہوئے گاؤں کی حد تک آ پہنچے تھے' دور پکی سڑک پر سے کبھی کبھی کوئی بس گزر جاتی تھی۔

بڑے خان صاحب خاموش تھے اور میں بھی...... میں تو خیر ویسے بھی اتنا باتونی نہیں ہوں۔ ہم جیسے شہری بابو جب گاؤں آتے ہیں تو یہاں کا پرسکون ماحول جیسے مہر بہ لب کر دیتا ہو۔ کم از کم میرا تو یہی تجربہ ہے۔ میں شہر کی بے معنی بھاگ دوڑ' مسابقت اور شور...... بے اماں اعصاب شکن شور سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔ گاؤں پہنچتے ہی جب پُروائی کے ٹھنڈے جھونکوں نے میری پیشانی کو سہلایا تو ٹوٹتے اعصاب کو پرسکون ہوتے پایا۔ مجھے شہر اور گاؤں میں وہی فرق محسوس ہو رہا تھا جو سیاہ کافی اور تازہ چھاچھ میں ہوتا ہے۔ پنجابی فلموں کے عین برعکس خاموش اور سویا سویا یہ گاؤں مجھے تو بہت بھایا تھا' نہ یہاں ظالم

جاگیردار تھا نہ فل میک اپ اور بے حد چست لباس میں ملبوس الہڑ مٹیاریں تھیں اور نہ ہی ان کے ساتھ کھیتوں میں کورس گانے والی چٹک مٹک کرتی سہیلیاں تھیں' علاوہ ازیں وہ روایتی ولن بھی کہیں نظر نہ آیا جو خواہ مخواہ بھولے بھالے ہیرو سے جھگڑا مول لے کر بڑھکیں مار مار کر بچوں کا دودھ پینا حرام کر دیتا ہے۔ میں نے کیونکہ پنجابی فلمیں دیکھ رکھی تھیں اس لئے یہ غیر فلمی خالص گاؤں مجھے تو بہت بھایا۔

ناظم علی خان کالج کے زمانے کا دوست تھا۔ ہم دونوں ہاسٹل میں بھی روم میٹ تھے اس نے بی اے میں فیل ہونے کے بعد زمینوں پر کام شروع کر دیا اور میں یونیورسٹی جا پہنچا' مگر میل ملاپ اور خط و کتابت جاری رکھی۔ پھر میں کالج میں آ گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ دوستی بھی گہری ہوتی گئی۔ اس مرتبہ وہ شہر آیا تو بصد اصرار مجھے گاؤں لے لیا۔

یہ گاؤں اور اس سے ملحق بہت سے گاؤں ان کی خاندانی جاگیر تھے' ان کے بزرگوں کی سوجھ بوجھ نے اس جاگیر میں اضافہ ہی کیا۔ گردونواح کے جس زمیندار نے بھی مقروض ہو کر زمین بیچنے کا ارادہ کیا یہ سب سے پہلے خریدار ہوئے چنانچہ ان کی زمینوں میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ادھر انہوں نے شادیاں بھی لڑکیوں کی بجائے زمینوں سے کیں اس سے مزید اضافہ ہوا اور اب بلاشبہ یہ علاقے کے بہت بڑے جاگیرداروں میں شمار ہوتے تھے۔

ناظم کے والد پہلے تعلیم یافتہ جاگیردار تھے مگر زمیندار سے زیادہ بزنس مین کا دماغ رکھتے تھے۔ انہوں نے آمدنی میں کئی طرح سے اضافے کیے۔ انہوں نے اس علاقے میں سب سے پہلے فروٹ فارم کا تجربہ کیا جو بے حد منفعت بخش ثابت ہوا۔ پھر پولٹری فارم' فش فارم اور بی فارم الغرض انہوں نے کئی طرح کے کاروباری تجربات کیے اور خوب دولت کمائی۔ یہ دولت بہت بابرکت ثابت ہوئی اس لئے کہ وہ پہلے کاروباری تھے اور اس لئے بھی کہ انہیں طوائفوں' سیاست اور مقدموں سے کسی طرح کی بھی دلچسپی نہ تھی بلکہ یہ سب لوگ ہی نیک اور پرہیزگار تھے۔

ناظم کے دادا دیکھنے کی چیز تھے۔ سب انہیں بڑے خان صاحب کہتے تھے۔ یہ بڑے جلالی بزرگ تھے۔ چوڑی ہڈیاں اور قوی جثہ کے وجیہہ بزرگ تھے۔ سفید پٹے اور

بڑی بڑی سفید مونچھیں تھیں۔ آواز کی گرج عمر کی چغلی نہ کھاتی تھی۔ بڑے خان صاحب قدیم دور کے وہ روایتی راجپوت معلوم ہوتے تھے جو اب صرف کاسٹیوم فلموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں کہ ایسے راجپوت تو اب راجستھان میں بھی ناپید ہیں۔ ان کے مزاج میں بھی وہی طنطنہ تھا جو اُس جاگیردار کے مزاج میں پایا جاتا ہے جو ایک سیکنڈ کے تردد کے بغیر اپنے مزارع کے پچاس جوتے لگوا سکتا ہو۔ انہیں اپنی اعلیٰ نسبی پر بڑا فخر تھا اور انہوں نے بھی اپنے آباء کی مانند ہزار جتن سے خون کو ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رکھا تھا۔ نہ ذات سے باہر بیٹی اور نہ ہی ذات باہر کی بہو لائے اور اس معاملہ میں اولادیں بھی اتنا تابعدار تھیں کہ آج تک کسی نے بھی شادی بیاہ کے معاملے میں چوں بھی نہ کی تھی۔ سنا ہے قدیم دور میں کسی لڑکی نے دم مارنے کی جرأت کی تھی مگر اس ناشدنی کا انجام انارکلی سے ملتا جلتا ہوا تھا ان معنی میں کہ انارکلی تو زندہ دیوار میں چنوادی گئی تھی جب کہ اس مردود کو زندہ حویلی کی دیوار کے نیچے پھینک دیا گیا تھا۔

گاؤں دو حصوں میں منقسم تھا ایک حصہ میں اونچی جگہ پر ان سب کے پکے مکانات اور خاندانی حویلیاں تھیں۔ سامنے کھلا میدان اور پھر کھیتوں کا سلسلہ تھا جن کے ساتھ رہٹ تھا۔ پھر ایک جوہڑ جس کے سامنے مزارعوں کی جھونپڑیاں اور کچے مکانات تھے۔ مالکوں اور مزارعوں میں تضاد تو ان کی صورت اور رنگوں تک میں دیکھا جا سکتا تھا۔ سب مالک سفید گول چٹے اور سرو قد تھے۔ ان کی آنکھوں میں جو سنہری مائل نیلاہٹ تھی اس نے صدیوں سے رنگ نہ بدلا تھا۔ جب کہ کھڑی ناک کو ان کا ٹریڈ مارک سمجھا جا سکتا تھا۔ صدیوں سے ان کی ساخت میں ایک ہی طرح کے جینز استعمال ہوئے تھے جس کے نتیجہ میں وہ سب ایک ہی ٹکسال میں ڈھلے سکوں جیسے تھے۔ ان کے برعکس تمام مزارعے کالے بھجنگ تھے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، چھوٹی ناک اور تنگ بیٹھی ہوئی پیشانی ان کی مخصوص پہچان تھی۔ دونوں ساتھ کھڑے ہوں تو اعلیٰ نسل کے آریہ اور شودر کا فرق دن اور رات کی مانند نظر آتا تھا۔ اگرچہ دونوں یعنی جاگیرداروں کی حویلیوں اور کچے پکے مکانوں اور جھونپڑوں کو الگ کرنے کے لئے کسی طرح کی دیوار نہ تعمیر کی گئی تھی، دیوار تو کیا وہاں تو کوئی باڑھ بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے پشت در پشت کے سلوک نے ایک غیر

مرئی دیوار تعمیر کر رکھی تھی' اگر ایک کو اپنی مراعات کا علم تھا تو دوسرے کو اپنی اوقات کا ...... اور اس لئے یہ جاگیر امن اور سکون کا گہوارہ تھی۔

ناظم علی خان سے طویل دوستی کے دوران میں اس سے یہ سب کچھ سنتا رہا تھا اس لئے مجھے اس گاؤں اور اس کی دو دنیاؤں کو سمجھنے میں کسی طرح کی بھی دشواری نہ ہوئی۔ اگر اب تک کے لکھے سے یہ محسوس ہو کہ وہاں کوڑے مارنے والے جابر آقا اور ادنیٰ غلام تھے تو یہ غلط ہے۔ وہ سب بہت اچھے اور نیک انسان تھے لیکن ان کی نیکی اور شرافت کے باوجود مزارعین نے بھی کبھی حد ادب سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کی تھی اور اسی لئے یہ دونوں طبقے متوازن انداز سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ بجز دادا جان یعنی بڑے خان صاحب کے۔ ویسے بڑے خان صاحب بھی نیک شریف اور پرہیز گار تھے مگر ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ طبعاً جلالی تھے اس پر مستزاد یہ کہ لوگوں کو دیکھنے اور چہروں کو پرکھنے کے ان کے اپنے معیار تھے ایسے معیار جو صرف ان ہی سے مخصوص تھے اور ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

''جاگیرداری کا مزا تو ہمارے زمانے میں تھا۔''

''اب کیا ہوا؟''

ہم دونوں سیر سے واپس آ رہے تھے وہ کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے ''فرق ہے بھی اور نہیں بھی ...... اسے یوں سمجھو کہ پہلے ...... یعنی میرے زمانے میں جب فصلوں کی کٹائی کا وقت آتا تو ہم کام کے قابل تمام مردوں اور لڑکوں کو ہانک کر لے آتے کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کر جائے۔ جب تک کام ختم نہ ہوتا وہ کھیتوں پر رہتے۔ بس! انہیں دو وقت کا کھانا مل جاتا اور چلتے وقت دانے دے دیتے اور وہ گھر چلے جاتے۔''

''خوش خوش؟''

''یقیناً ...... ہم نے کبھی کسی کا حق نہیں مارا۔''

''اور اب؟''

''اب ان سے معاملات طے کیے جاتے ہیں' وقت طے کیا جاتا ہے' حساب کتاب ہوتا ہے اور وہ پھر بھی خوش نہیں ہوتے۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ ان کے خیال میں معاوضہ کم ہوتا ہے' انہیں جو کھانا دیا جاتا ہے وہ ان کے معیار کا نہیں' ان سے تمیز سے بات نہیں کی جاتی اور ایسی ہی اور گھٹیا باتیں۔ کمی کمین کھانے پینے سے اونچا تو سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہیں نا۔''

''دراصل اب زمانہ بدل چکا ہے۔''

''لعنت بھیجو اس زمانے پر'' وہ جھلا کر بولے ''اب کل ہی کی بات ہے کہ اس خبیث دے پتّر نے کھیت سے گنا توڑ لیا اور ہم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔''

خبیث دا پتّر دراصل موجے دا پتر تھا۔ موجا بھی خاندانی مزارعین میں سے تھا اور اس کا یہ بیٹا دس بارہ برس سے زیادہ کا نہ ہوگا۔

''خان صاحب! بچہ ہی تو ہے۔''

وہ بولے ''ڈاکٹر صاحب! آپ ایسی باتیں نہیں سمجھ سکتے' وہ مجھ سے آ کر مانگے تو میں اپنی رضا سے سارا کھیت دے سکتا ہوں لیکن کسی کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ہماری منشا کے بغیر کھیت سے گنا تو کیا گھاس کا تنکا بھی لے جا سکے' یہ سرکشی ہے۔''

''وہ مگر''

مگر وہ میری بات ختم ہونے سے پہلے بولے۔ ''جس طرح کسی بھی کمی کمین کو یہ اجازت نہیں کہ وہ میرے حقہ سے حقہ پی سکے' اس کی یہ جرأت نہیں کہ وہ چارپائی پر میرے ساتھ بیٹھ سکے' اسی طرح میرے کھیت سے بھی بلا اجازت کچھ نہیں توڑ سکتا۔ یہ اصول کی بات ہے اور میں بااصول انسان ہوں۔''

''اس کے باوجود کہ یہ کھیت اس کے پسینے سے تیار ہوتے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''بالکل'' وہ دوٹوک لہجہ میں بولے۔ ''یہ اصول کی بات ہے۔'' اور پھر فاتحانہ لہجہ

میں بولے ”کیا تم پسند کرو گے کہ تمہاری کلاس میں ڈسپلن نہ ہو۔“

ہم دونوں اب مزارعوں کی جھونپڑیوں اور کچے مکانات کے پاس سے گزر رہے تھے وہ زور سے کھنکارے۔ یہ کھنکار نہ تھی کسی گھنٹی کی آواز تھی کہ تمام مرد اور بچے باہر نکل آئے۔ میاں صاحب سلام! میاں صاحب سلام! کا شور مچ گیا۔ بڑے خان صاحب نے گردن کے خم اور چھڑی کے اشارے سے سب کے سلاموں کا جواب دیا اور پھر آگے بڑھنے کو تھے کہ ٹھٹھک کر کھڑے رہ گئے' سامنے سے موجو کا بیٹا آ رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب سے یوں گردن اکڑائے گزر گیا گویا ہم دو درخت تھے۔

”دیکھی اس حرام زادے کی کرتوت؟“

”کیا؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

”اس نے سلام نہیں کیا“

”میرا خیال ہے اس نے دیکھا ہی نہیں۔ خاصہ اندھیرا ہو گیا ہے نا۔“

”اندھیرا نہیں اندھیر کہو“ وہ غصہ سے کھول رہے تھے۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا اور مجھے دیکھ کر گردن اور بھی اکڑا لی تھی' سور کے بچے کی کھال ادھیڑ دوں گا۔“

”جانے بھی دیں بچہ ہی تو ہے۔“

”بچہ!“ وہ پھنکارے ”بچہ نہیں سنپولیا سنپولیا کہو سپنولیا“ انہوں نے نفرت سے تھوکا' پھر بولے ”ان حرام زادوں کے اصلے میں فرق ہے۔ یہ گندہ خون ہے گندہ خون...... سمجھے؟ کم اصل سے وفا نہیں' سمجھے؟ اور گندہ خون ہمیشہ گندہ خون ہی رہے گا۔ کمال ہے ہم کتوں اور گائے بھینسوں کی نسل کے معاملے میں کتنے محتاط ہوتے ہیں مگر انسانوں کے معاملے میں اصل' نسل اور خون کی اہمیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔“

میں نے بات آئی گئی کرنے کو کہا ”آپ وہ کھیت والی بات کر رہے تھے۔“

”کون سے کھیت والی بات؟ ہاں وہ کھیت والی؟ عرصہ پہلے کی بات ہے ہمارے کھیت سے اسی طرح کسی نے مکئی اڑا لی...... یہ حرکت کسی باہر کے گاؤں والے نے کی تھی' ہم نے کھوجی بلائے اور کھرا پکڑتے ہوئے ہم اس کے گاؤں میں جا پہنچے

اور اسے اس کے گاؤں میں الٹا لٹکا کر وہ لتر مارے کہ اس کی سات پشتیں بھی یاد رکھیں گی۔ تمام علاقہ میں ہماری دھاک تھی اُن دنوں۔'' وہ کچھ دیر تک اس مار کی یاد سے لطف اندوز ہوتے رہے پھر بولے۔'' دراصل جاگیرداری دھاک ہی کا نام ہے' اگر اپنے علاقہ میں دھاک نہ ہو تو مزارے خوف نہیں کھاتے ہیں' نہ پٹواری خاطر میں لاتا ہے اور نہ ہی تھانہ دار پرواہ کرتا ہے۔ جاگیرداری دھاک کے بغیر بے کار ہے۔'' وہ پھر غصہ سے بولے۔'' اور اسی لئے اس حرامی کے پلے کو سبق سکھانا ضروری ہے' اس کی اکڑی گردن توڑنی ہوگی۔''

''جانے بھی دیں خان صاحب!'' میں نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا'' ناسمجھ بچہ ہے۔ اسے ادب آداب کا کیا پتہ'' وہ دانت پیس کر بولے۔'' اس کے باپ کو اس سے چھوٹی عمر میں یہ سب معلوم تھا۔ ڈاکٹر صاحب! دیوار کی بنیاد اگر مضبوط ہو اور اس میں کوئی رخنہ نہ ہو تو دیوار جتنی چاہو اٹھا لو وہ ہمیشہ مضبوط رہے گی لیکن ایک' چھوٹا اور معمولی سا رخنہ بھی اسے کمزور کرنے کو کافی ہوتا ہے۔ نادان بچہ' وہ حقارت سے تھوک کر بولے'' نہیں!''

......اور پھر انہونی ہوگئی!

موجے کے بیٹے نے جاگیرداروں کے ایک بیٹے کی پٹائی کردی!

میں نے اب تک صرف یہ پڑھا تھا کہ غصہ میں منہ سے جھاگ نکلتی ہے لیکن اس دن میں نے بڑے خان صاحب کے منہ سے واقعی جھاگ نکلتی دیکھی وہ غصہ سے کانپ رہے تھے۔ ایسا شدید غصہ کہ میں اس غصہ سے شاید جانبر نہ ہوسکتا۔

میری دانست میں تو موجے کی سرزنش اور اس کے بیٹے کو دو تھپڑ لگا کر بھی معاملہ سلجھایا جاسکتا تھا مگر بڑے خان صاحب کی منطق کچھ اور تھی وہ اس کی سزا کو مثالی سبق آموز بلکہ عبرت انگیز بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا گاؤں بلکہ اردگرد کے گاؤں کے لوگ جمع کئے گئے تاکہ سب کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہو اور ملزم قرار واقعی سزا پائے۔

میدان میں بڑے اہتمام سے چھڑکاؤ کیا گیا' شرفاء کرسیوں اور چارپائیوں پر براجمان تھے' بڑے خان صاحب اور دو تین اور معززین الگ الگ

ایک بڑی سی چارپائی پر سج رہے تھے۔ ایک کونے کی کرسی پر میں بھی ٹک گیا۔ میں نے نگاہ دوڑائی تو موقع کی نزاکت اور اپنی اہمیت کا احساس سے سب کے سفید چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ سب کی کھڑی ناکیں ایک جیسی تھیں اور سب کی سنہری مائل نیلی آنکھیں سامنے مزارعین کی قوس پر جمی تھیں جو سب کے سب سیاہ تھے اور ان کی سیاہی میں وہ چمک تھی جو صرف چلچلاتی دھوپ کے پسینہ سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے ان کے پیچھے ان کی عورتیں سہمی ہوئی سیاہ چڑیوں کی مانند الگ سمٹی ہوئی تھیں۔

جس شریف زادہ کی پٹائی ہوئی تھی اس نے رو رو کر ماجرا بیان کیا۔ شرفا کے چہرے غصہ سے سرخ ہو گئے۔

سب خاموش تھے۔ فضا میں تناؤ کو بجلی کی لہر کی مانند محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''موجو! تجھے کچھ کہنا ہے'' بڑے خان صاحب گرجے۔

سیاہ جسموں کے گندے چھپڑ سے موجو گندی لہر کی طرح ابھرا لڑکھڑایا مگر پھر سنبھل گیا۔ وہ ہاتھ جوڑے خاموش تھا۔

''بول!'' وہ پھر گرجے۔

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا ''حضور مائی باپ ہیں۔ میرے باپ دادا نے حضور کے باپ دادا کی خدمت کی ہے اور ان کے باپ دادا نے ان کے باپ دادا کی۔ ہماری نسلوں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور آج تک کسی نے ایسی حرکت نہ کی'' موجو ایک لحہ کو خاموش رہا۔ لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنے اور نہ کہنے میں فیصلہ کر رہا ہے' پھر جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔ ایک طویل سانس لی اور اپنے بیٹے کو کان سے پکڑ کر اٹھایا اور سب سے مخاطب ہوا۔ ''حضور اسے دیکھئے۔ کیا یہ سفید رنگ میرا ہے؟ کیا یہ اونچی ناک میری ہے؟ کیا یہ چمکیلی نیلی آنکھیں میری ہیں؟''

''یہ بات کیا ہوئی۔'' مجمع میں سے کسی کی آواز اُبھری۔

وہ جیسے زچ ہو کر تھکے لہجہ میں بولا۔

''مجھ سے آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ اس نے آپ کے بیٹے کو کیوں مارا؟ مجھے کیا

پتہ کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن نہیں شاید مجھے پتہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہ گندہ خون ہے۔ یہ گندہ خون میرا نہیں ہو سکتا۔ میرا خون ہوتا تو میری مانند آپ کی جوتیوں میں رہتا'' اور پھر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر چیخا۔

''بول کنجری..... بول..... یہ کس حرامزادہ کا ہے۔''

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کھونٹا

سڑک کوٹنے والا انجن آہستہ آہستہ بڑھا چلا آ رہا تھا۔ پانچ ٹن وزن کے نشہ میں سرشار ٹوٹ کر ریزہ بنتے' پستے اور پھر پس کر سرمہ بنتے پتھروں' روڑوں اور کنکروں سے بے پرواہ تباہ کن آہستہ خرامی کی تصویر۔

وہ انجن سے صرف چند فٹ کے فاصلہ پر پڑی ہے۔ روڑوں کے نوکیلے بستر پر بھاپ دیتے سیال تارکول کی سیاہ چادر اوڑھے۔ اس کی چیل جیسی تیز آنکھیں بند ہیں۔ وہ ہونٹ سختی سے بھینچے ہیں جن سے ہر وقت کانوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی آوازیں خارج ہوتی رہتی تھیں۔ اس پر گرم تارکول کی رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی ہے...... مگر وہ اس سیاہ بارش میں بہنے کی بجائے جیسے سیاہ دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ پھر پانچ ٹن فولاد اس پر سے گزر جاتا ہے وہ جو پہلے نقش خاک تھی' اب سیاہ چمکیلی سڑک میں تبدیل ہو چکی ہے۔ بسوں' لاریوں' ٹرکوں' ٹرالیوں' ویگنوں' کاروں' رکشوں اور سکوٹروں کا بوجھ برداشت کرنے کو۔

سامنے کھڑکی میں سے اسے سڑک کوٹنے والا انجن نظر آ رہا تھا جس کے گرد محلہ کے بچوں کی ٹولیاں شور مچا رہی تھیں۔ گھٹنوں تک اونچے اور تارکول سے سیاہ بوٹ پہنے مزدور کام کر رہے تھے مگر اس کے لئے تو یہ سب گویا خاموش فلم کا منظر تھا۔ کیونکہ اصل فلم تو اس کے ذہن میں چل رہی تھی۔ نفرت کی فلم! ایسی شدید نفرت جو فانی انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہوتی' نفرت کے اس کینسر کی جڑیں گویا اعصاب بن کر تمام جسم میں پھیل چکی تھیں جس کے

نتیجہ میں وہ نفرت دیکھتا' نفرت سونگھتا' نفرت سانس لیتا اور نفرت تھوکتا!

سڑک کوٹنے کا انجن اب ان کی کھڑکی کے سامنے سے گزر رہا تھا اور اس کی دھمک سے گھر لرزتا محسوس ہو رہا تھا اس نے کرسی کے دونوں بازوؤں کو پوری طاقت سے تھام لیا اتنی شدت سے کہ پوروں میں خون اتر آیا۔ ایسے لگا جیسے انجن دیوار توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہو گیا ہے اور اب وہ ڈرائنگ روم کی دیواریں مسمار کرتا اور فرنیچر کا ریزہ ریزہ بناتا بیڈ روم کی دیوار گرا رہا ہے جہاں وہ اپنے بستر پر لیٹی ہے' مارے خوف کے اس کی آنکھیں طشتریوں میں تبدیل ہو گئی ہیں' اس کا منہ کھلتا ہے تو حلق کے قفس میں بند چیخ رہائی حاصل کر لیتی ہے۔

وہ جاگا تو جسم پسینہ میں بھیگ رہا تھا۔ چیخ اس کے حلق سے نکلی تھی؟ مگر نہیں' وہ تو سکون سے سو رہی تھی۔ یہ کم بخت ہمیشہ ہی سکون سے سوتی ہے یہ تو میں ہوں جو راتیں جاگتا ہوں اور سوتا ہوں تو خوفناک خواب سونے نہیں دیتے۔ ایک یہ منحوس ہے کہ لیٹتے ہی آنکھیں بند کر کے بھیانک خراٹے لینے لگتی ہے۔

اس نے ایک نظر سوتی بیوی کو دیکھا۔ اس کا تنا ہوا چہرہ جو دن میں کسی فریم میں کسا ہوا محسوس ہوتا تھا اب پر سکون اور آسودہ آسودہ تھا۔ اس کی آنکھیں خوبصورت نہ تھیں۔ خوبصورت تو کیا بلکہ ملگجی پتلیوں کی وجہ سے ان میں صحت مند آنکھوں کی چمک بھی نہ تھی لہٰذا آنکھیں چار کرنے پر یوں محسوس ہوتا گویا قصاب کی دکان پر دھری بکری کی ''سری'' سے آنکھیں چار ہو گئی ہوں جس کے نتیجہ میں اعصاب میں کراہت کی لہر دوڑ جاتی۔ مگر اب بند آنکھوں کے پپوٹوں پر پلکوں کی جھالر سج رہی تھی اور وہ بری نہ لگ رہی تھی۔ دن کو جب وہ وہیل چیئر پر ہوتی تو احساس نہ ہوتا مگر اب بے سدھ لیٹی کو دیکھ کر یہ گھناؤنا احساس ہوا کہ یہ جسم ایک کا نہیں بلکہ دو عورتوں کا ہے۔ ایک وہ عورت جس کی گردن' پر نچی مرغی جیسی ہے جس کے خشک بازوؤں میں سوکھی شاخ جیسا کھردرا پن ہے اور دوسری وہ جس کا نچلا دھڑ پنڈلیوں تک متناسب سانچے میں ڈھلا ہوا تھا اور خوبصورت پاؤں پر ختم ہوتا تھا۔ اس کے جسم کا مجموعی تاثر یوں تھا گویا روبنز کی کسی دوشیزہ پر میکبتھ کی جادوگرنی کا سینہ جوڑ دیا گیا ہو۔

اس نے خوابیدہ بیوی کو دیکھا تو ہاتھوں میں خوابیدہ کھجلی جیسے بیدار ہو گئی یوں کہ

انگلیاں بے چینی سے خود بخود ہلنے لگیں۔اس کے مضبوط ہاتھوں اور توانا بازوؤں میں اس کی گردن مروڑنے کی خواہش بجلی کی رو بن کر دوڑ گئی۔

وہ گھبرا کر بیڈروم سے باہر نکل آیا۔

فریج سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کر ایک ہی سانس میں معدہ میں انڈیل لیا۔ پانی کی ٹھنڈک اعضا اور عضلات میں پھیل رہی تھی اور یوں اس نے تنے اعصاب کو سکون پذیر محسوس کیا۔مڑا تو دیوار پر آئینہ میں اپنی شبیہہ کو گھورتے پایا۔ چوڑا چہرہ' فراخ پیشانی' مضبوط ٹھوڑی' توانا گردن اور چوڑا سینہ کس چیز کی کمی تھی اس میں؟ پھر۔؟ پھر۔؟اس نے جیسے آئینہ سے سوال کیا مگر آئینہ کیا جواب دیتا کہ اس میں گھورتی شبیہہ کی آنکھوں میں جو سلگاہٹ تھی وہ کسی سوال کا جواب ہونے کے برعکس بذات خود ایک سوال تھی۔

وہ مڑا اور اس نے دوبارہ فریج کھول کر پانی کا ایک اور گلاس پیا۔

وہ کمرہ میں کھڑا تھا۔ بظاہر پرسکون' مگر کھلتی بند ہوتی مٹھیاں داخلی اضطراب کی غماز تھیں' پھر سر جھٹک کر جیسے اس نے کسی خیال کو جھٹکا۔اب وہ مڑا تو سامنے اس کا دروازہ تھا۔اب وہ گویا دو آزاد مملکتوں کے درمیان ''نومینز لینڈ'' میں تھا۔ اِدھر اس کی منکوحہ تھی اُدھر اس کی ملازمہ' اس کی وہیل چیئر دھکیلنے والی ملازمہ! منکوحہ کے اپاہج وجود کا شاداب سایہ' جس کی نمکین گردن کے بکھرے بال پیار سے ہٹانے کو جی چاہے' جس کے بھرے بھرے لبوں پر بالوں کی سرمئی لکیر میں چمکتا سیاہ تل اس کاجل کا ہم پلہ تھا جسے فطرت نے خود اس کی آنکھوں میں لگایا تھا۔ ملازمہ کے جسم کی پھلواری ان تمام نعمتوں سے مالا مال تھی جن سے مالکہ کے جسم کا شجر محروم تھا۔

اب یہ بھی اس کی بیوی کی ابنارملٹی ہی تو تھی کہ وہ وہیل چیئر دھکیلنے کے لئے ہمیشہ شاداب اور تر و تازہ لڑکی ملازمہ رکھتی۔ وہ ہمیشہ اس کی ممانعت کرتا تھا کہ اس بے معنی جسم کے مقابلہ میں اپنے معانی خود سمجھانے والے جسموں کا یہ تضاد ناقابل برداشت تھا۔مگر وہ وہیل چیئر کی آمر تھی اس لئے من مانی کرتی۔ نہ جانے وہ کہاں سے چھانٹ چھانٹ کر پکے جسموں والی تگڑی لڑکیاں تلاش کر لاتی۔ ان سے زرخرید لونڈیوں کی طرح کام لیتی۔ دن بھر کوسنے' گالیاں اور ڈانٹ ڈپٹ اضافی انعام! ان حالات میں بیشتر تو خود ہی

ملازمت چھوڑ کر چلی جاتیں اور جس ڈھیٹ نے زیادہ ضبط کا مظاہرہ کیا یا جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر تمام کڑوے گھونٹ پی جاتی اسے یہ خود چلتا کرتی اور اس حساب سے نکالتی کہ چند دن کی تنخواہ مار لیتی۔

اکثر عورتیں اپنی ملازماؤں سے ایسا ہی سلوک کرتی ہیں لیکن اس میں عجیب بلکہ عجیب وغریب عادت یہ تھی کہ انہیں زنانہ کی بجائے مردانہ لباس پہنواتی۔ مردانہ لباس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اسمارٹ سی جینز اور جیکٹ پہنتی تھیں۔ ایسا ہوتا تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا کیوں کہ یوں جسم ابھر کر نکھر جاتا۔ وہ تو اس کے برعکس اس کی پرانی قمیضوں' بشرٹوں اور بے کار سلیپنگ سوٹوں کے پائجاموں میں انہیں ملبوس کرتی۔ بڑا اکرم کیا تو اس کا پھٹا ہوا کرتا اور شلوار عنایت فرمادی جسے وہ خود ہی کاٹ کر مناسب سائز پر لا کر پہن لیتیں۔ ٹھیک ٹھیک ہوگئی تو درست ٹھیک نہ ہوئی تو درست۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ ٹخنوں تک جاتی قمیض یا اونچی شلوار میں وہ کتنی مضحکہ خیز نظر آتی تھیں۔ اسے اپنی بیوی کی جن عادتوں سے شدید نفرت تھی ان میں سے ایک ملازم لڑکیوں کو بدرنگ اور بدوضع کپڑے پہنا کر ان کی نسوانیت کی تذلیل کرنے کی عادت بھی تھی۔ جب کہ خود وہ ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی۔ بہترین تراش کے کپڑے' فل میک اپ' پرفیوم

وہ پاؤڈر سے لپے سفید چہرہ پر سے جب نظریں اٹھا کر وہیل چیئر کے پیچھے کھڑی بے حس وحرکت کھڑی لڑکی کو دیکھتا تو اس کا سلونا پن آنکھوں میں اتر جاتا۔ کہنیوں تک اڑسی ہوئی مردانہ قمیض میں سے اس کے بھرے بھرے بازوؤں پر بالوں کی تحریر پڑھنے کو جی مچل اٹھتا۔ اس نے مدت سے اپنی بیوی کو چلتے نہ دیکھا تھا بلکہ اب تو اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ کیسے چلتی تھی۔ مگر یہ لڑکی تو کسی بیلے ڈانسر کی مانند کولہوں کو ہلکورے دے کر چلتی تھی۔

اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک اور گلاس پیا اور پھر مڑ کر اس نے لڑکی کے اندھیرے کمرے کی جانب دیکھا جس کے باہر بجلی کی گھنٹی لگی تھی۔ وہ گھنٹی جس کے مدار پر اس کی زندگی گردش کرتی تھی۔ رات کو جس وقت بھی بیوی کی آنکھ کھلتی' اسے طلب کرنے کی ضرورت محسوس کرتی یا بعض اوقات بلاضرورت بھی بٹن دبا دیتی تو خاموش گھر گھنٹی کی کرخت آواز سے جیسے چیخ اٹھتا اور وہ آنکھوں میں کچی نیند کا خمار لئے بھاگی آتی۔

کیا بیوی اس کا امتحان لینے کے لئے خوبصورت لڑکیاں لاتی تھی اور جب وہ امتحان میں کامیاب ہو جاتا تو پھر جھنجھلا کر ان کی ہفتہ بھر کی تنخواہ مار کر نکال باہر کرتی ؟ وہ اس سوال کا صحیح جواب جاننا چاہتا تھا مگر جواب کون دے؟ جواب دینے والی ہی نے بجھارت رکھی تھی۔

میاں بیوی میں عجب قسم کی سرد جنگ جاری تھی' یہ جنگ طویل تھی۔اس میں چھوٹی بڑی کئی لڑائیاں آئیں جو زیادہ تر اس کی بیوی نے جیتیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جس کوٹھی میں وہ رہتا تھا وہ بیوی کے نام تھی' بینک اکاؤنٹ بیوی کے نام تھا۔کوٹھی کے باہر نیم پلیٹ اس کی نہیں بلکہ بیوی کی تھی۔وہ اچھی ڈاکٹر تھی اور کامیاب پریکٹس کرتی تھی۔جب غریب والدین کے لیکچرار بیٹے سے شادی طے ہوئی تو بظاہر یہ ایک مفید شادی تھی کہ جو مرد محض لیکچرار ہو اسے کوٹھی کار اور پریکٹس والی لیڈی ڈاکٹر سے بہتر اور کیا مل سکتا تھا۔اب اگر وہ عمر میں اس سے کچھ بڑی تھی تو بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

وہ خوش مزاج اور ذہین مرد تھا۔پسندیدہ استاد اور اسٹاف میں مقبول تھا مگر یہ شادی بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ بیوی تو جیسے اس کے تن شجر کے لئے آکاس بیل ثابت ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اب بھی خوش مزاج ہی رہا وہ اب بھی ذہین ہی رہا' وہ اب بھی طلبہ کا پسندیدہ تھا اور اسٹاف میں مقبول تھا۔مگر یہ سب تو معمول کی زندگی کا دکھاوا تھا۔مسلسل ضبط نے اندر کے پھلیے شجر جیسے مرد کو سوکھے تنے میں تبدیل کر دیا تھا۔کتنے جتن کیے مگر ان میں میاں بیوی والی بات پیدا نہ ہو سکی۔بس ڈبل بیڈ کا ڈھونگ باقی رہ گیا۔میاں نے ٹیوشن پڑھنے والے طلبا کی تعداد میں اضافہ کر دیا' بیوی نے خود کو کلینک میں مزید مصروف کر لیا۔فیس میں اور اضافہ کر لیا اور نسخہ میں دوائیں اور زیادہ مہنگی لکھنی شروع کر دیں مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ منہ سے الفاظ کی جگہ جیسے نبولیاں نکلنے لگیں۔

نیند نہیں آ رہی تھی سو اس نے چائے کا کپ بنایا اور اپنی اسٹڈی میں آ گیا۔ سامنے میز پر ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا۔

وہ لیکچرار تھا اس لئے وہ مرد شریف تھا۔کبھی کسی ملازم لڑکی سے بے تکلف نہ ہوا تھا۔بے تکلفی تو کجا اسے تو ان پر ترس آتا تھا کہ وہیل چیئر میں جتی یہ جوان لڑکیاں اس کی

باتوں کے کڑوے گھونٹ بھرنے پر مجبور تھیں۔ ویسے اس ضمن میں بیوی کے خوف کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر شریف شوہروں کی مانند اس نے بھی یہ حقیقت تسلیم کر رکھی تھی کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے اس خوف نے بے چارگی کے جس احساس کو جنم دیا وہ اگرچہ نفرت پر منتج ہوا مگر اس کے باوجود اس نے بیوی کو گرفت کا کبھی موقع نہ دیا تھا۔ وہ نفرت اور خوف کی جس دیوار میں چنا تھا اب اس کے لئے اس دیوار کو توڑنا آسان نہ تھا مگر یہ لڑکی' یہ نرم چہرے اور تر آنکھوں والی لڑکی اب روزنِ دیوار ثابت ہو رہی تھی۔ اگرچہ وہ پیش رو لڑکیوں کے مقابلہ میں زیادہ کم گو اور سہمی ہوئی تھی مگر اس کے سلونے پن میں کوئی ایسی بات تھی کہ اپنے گرد کھنچے حصار میں دراڑ پڑتی محسوس کی۔ اگرچہ ان میں چند ضروری اور بے حد رسمی جملوں کا تبادلہ ہی ہوتا تھا مگر ان کی آنکھیں گفتگو کرتی تھیں۔ اور کیا مزے دار گفتگو!

چائے کا آخری گھونٹ اور سگریٹ کا آخری کش...... کھڑکی سے رات کے پچھلے پہر کی خنکی اعصاب کو سکون دے رہی تھی۔

اور تب اچانک اس کے جسم کے اندر جیسے گھنٹی بجی' مڑ کر دیکھے بغیر ہی اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ وہ دروازہ میں کھڑی مہک رہی ہے۔ خاموش رات' خاموش گھر اور اس خاموش کمرہ میں وہ مہک دیتا جسم جیسے اس کے وجود میں پھیلے خوف کے جالوں کو توڑتا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم میں گرم لہر دوڑتی محسوس کی یوں کہ جسم کپکپا اٹھا۔

وہ مڑا تو اسے دروازہ کی دہلیز پر منتظر آنکھوں کے ساتھ پایا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں مگر اب آنکھوں کی جگہ جسم گفتگو کر رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ کھڑی تھی مگر اس کے جسم سے خارج ہوتی لہریں جال بن کر اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ وہ جیسے سلو موشن میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا قدم اور...... پھر گھنٹی کی کرخت آواز نے انہیں شیشے کی کرچیوں میں تبدیل کر دیا۔

وہ ننگے پاؤں بیڈ روم کی جانب بھاگی جا رہی تھی جہاں سے اس کی بیوی کے چیخ چیخ کر بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کتنا چیخی' کتنا بولی اسے اس کا احساس نہ تھا وہ تو کتابوں کی الماری سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ پھر اس کی بیوی خاموش ہو گئی' مکان خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے کمرہ کی طرف جا رہی تھی جب وہ اسٹڈی کے سامنے سے گزری تو اس کا سر

اور بھی جھک گیا۔ وہ کتنی دیر اسی طرح کھڑا رہا اسے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ثانیے اس کی نبض میں تبدیل ہو گئے اور دھڑکن لمحات کی چاپ سے ہم آہنگ تھی۔ بالآخر اس نے خود کو گھسیٹا فریج سے ٹھنڈے پانی کی دو گلاس پیئے اور بیڈ روم کا رخ کیا۔

وہ دہلیز پر رک گیا۔

وہ کروٹ بدلے لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں جسم ساکت تھا۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا' بیڈ کو اور لیٹی بیوی کو۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا گیا اور پھر اپنے حصہ کے بستر پر اس احتیاط سے لیٹا کہ کہیں بستر کی حد سے تجاوز نہ کر جائے۔ اس کے لیٹنے پر بیوی کے جسم میں خفیف سا ارتعاش پیدا ہوا مگر وہ اپنے بستر کی حد میں خاموش اور ساکت رہی۔ بیوی کے جسم کی تیز بو پرفیوم سے بھی نہ دب رہی تھی۔ خاوند نے ناک کے بجائے منہ سے سانس لینی شروع کر دی۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بیوی کی سانس ہموار ہو رہی ہے پھر آہستہ آہستہ خراٹے لینے لگی مگر وہ اپنے حصہ کے بستر پر اپنی حد میں محصور' کاٹھ کا جسم لئے لیٹا رہا' نیند کی اور رات کی چاپ سنتا۔

O.....O.....O

جلے پاؤں کی بلی

وہ پلنگ پر بیٹھی بے چینی سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی!

جس بے نام خواہش اور اس کی آسودگی کی خلش نے اس میں بیک وقت سیسہ اور پارہ بھر کر اسے اعصابی بے چینی کی دلدل میں پھنسا رکھا تھا۔ آج اس کی تکمیل کا وقت آ پہنچا تھا۔

وہ اکیلی تھی!

گھر، گھر والوں سے خالی تھا، باتوں، قہقہوں اور جھگڑوں سے پُر کمرے خاموش تھے اور تنہا گھر میں وہ اکیلی تھی! بالکل اکیلی!! اتنی اکیلی کہ وہ جو چاہتی کر سکتی، کسی کو گھر بلا سکتی تھی یا کسی کے ساتھ اس کے گھر جا سکتی تھی، حتیٰ کہ بھاگ بھی سکتی تھی۔ اتنی اکیلی تھی وہ!

تنہائی اور کچھ کر گزرنے کے امکان نے ذہن کو کچھ اور بھی الجھا دیا تھا اور حالت کانچ کے اس نازک برتن جیسی تھی جس کے لئے معمولی سی ٹھوکر بھی کافی ہوتی ہے۔

اور پھر وہ اٹھی۔ اس نے اب مصمم ارادہ کیا تھا۔ ''یہ کرنا ہی ہوگا۔'' دل نے دماغ کو سمجھایا۔ اس کی منزل دور نہ تھی اور نہ ہی موت سے مشابہہ نیند طاری کرنی تھی۔ اسے تو صرف اوپر کی منزل تک جانا تھا۔ جب سے بے نام خواہش نے نام پایا تب سے ہی وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی اسی لئے اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر والوں کے

ساتھ میلاد کی تقریب میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر اب منزل کی 17 سیڑھیاں اوپر جا کر ہمت جواب دے رہی تھی۔ دو قدم چلنے پر اس نے لڑکھڑا کر خود کو گرتے محسوس کیا تو دیوار کا سہارا لے لیا۔

دل نے کہا۔ ''اب یا کبھی نہیں!''

وہ سنبھل کر بلکہ اکڑ کر کھڑی ہوگئی اور اب جو چلی تو یوں احتیاط سے قدم رکھ رہی تھی گویا تنے ہوئے رسہ پر چل رہی ہو۔ سامنے سیڑھیاں دیکھ کر یوں محسوس ہوا گویا وہ کبھی بھی ان پر نہ چڑھ سکے گی۔ نجانے یہ سیڑھیاں اسے کن بلندیوں پر لے جا کر بے رحمی سے نیچے دے ماریں۔ سیڑھیاں چڑھی تو وہ ہانپ رہی تھی۔ سانس تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ سولہویں سیڑھی پر وہ ایسی تھکن محسوس کر رہی تھی گویا میلوں چلی ہو، سامنے کلیم کے کمرہ کا دروازہ کسی بدکار کی طرح اسے دعوت دیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پر اٹک گئی۔

دل پکارا۔ ''اب یا کبھی نہیں۔''

اور ایک چھلانگ میں وہ کمرے کے اندر تھی۔

کمرہ خالی تھا۔

اس کی نگاہیں وارڈ روب پر رک گئیں۔ قد آدم آئینہ میں اڑی اڑی رنگت والی ایک لڑکی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ کیا اس لڑکی کی آنکھوں میں خوف تھا؟ کیا اس لڑکی کی آنکھوں میں وحشت تھی؟ اس نے ہاتھ بڑھا کر وارڈ روب کے پٹ یوں کھولے گویا وہ کوئی تابوت ہو۔ چوں چرر کی آواز ختم ہوتے ہی اس کے سامنے ہینگروں میں لٹکے سوٹوں سے چکا چوند ہوگئی۔ ایک طرف خوش رنگ ٹائیوں سے قوس قزح بن رہی تھی۔ ایک ریک میں قمیصیں تہہ کر سلیقہ سے ایک پر ایک رکھی تھیں، نیچے ایک قطار میں جوتے، مکیشن اور چپلیاں دھری تھیں، پاس ہی پالش کی ڈبیاں اور برش رکھے تھے۔

وہ خود کو اناڑی چور کی طرح محسوس کر رہی تھی جو پہلی مرتبہ تجوری کھول بیٹھا ہو۔ پھولی سانسوں اور پھیلی پتلیوں سے وہ اس خزانہ کو دیکھ رہی تھی۔

دل نے یاد دلایا۔ ''اب یا کبھی نہیں۔''

وہ کانپتے ہاتھوں سے کپڑے اتارنے لگی۔ مرتعش انگلیوں سے قمیص کے بٹنوں

کو کھولا تو یوں لگا جیسے انگلیاں ان بٹنوں سے ہی چپک کر رہ جائیں گی۔ اس نے یوں جھٹکے سے قمیص اتاری کہ پہلو کی سلائی ادھڑ گئی۔ کپڑے اتارنے کے چند لمحوں بعد تک وہ خود کو آئینہ میں دیکھتی رہی۔ اسے جسم کی گولائیوں سے گھن آ رہی تھی۔ بالوں کے بغیر جسم کی چمکیلی جلد اس میں کراہت کا احساس پیدا کر رہی تھی۔ ننگے جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ گرمی نہ تھی مگر وہ خود کو گرم محسوس کر رہی تھی۔ اچانک گرم جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی سے شروع ہونے والی اس لہر نے اس کے اعصاب کو یخ کر دیا۔ گھر والے آ رہے تھے۔ اس نے سانس روک کر آوازیں سننے کی کوشش کی' پسلیوں سے ٹکراتے دل کو دبانے کے لئے سینہ پر ہاتھ رکھ دیا مگر نہیں یہ اس کا وہم تھا' کوئی بھی نہ تھا۔ پہلے کی طرح اب بھی گھر' گھر والوں سے خالی تھا۔ باتوں' قہقہوں اور جھگڑوں سے پر کمرے خاموش تھے۔ خاموش کمروں اور تنہا گھر میں وہ اکیلی تھی۔ بالکل اکیلی! اتنی اکیلی کہ وہ جو چاہتی کر سکتی تھی۔

جسم میں اطمینان کی گرم رو دوڑ گئی۔

اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر پھرتی سے بھائی جان کی قمیص اور کوٹ پہن لیا۔

اب وہ پرسکون تھی! دل کی دھڑکن تھم چکی تھی اور سانس میں تیزی نہ رہی تھی۔ پھیلی ہوئی پتلیاں اب اصلی حالت پر تھیں۔ آئینہ میں ایک سکھ لڑکا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پیشانی پر جھکی ایک لٹ کو کھینچ کر پیچھے کر دیا۔ قمیص کا آدھا کالر بلیزر کے اندر تھا اور آدھا باہر' اس نے کالر کو بلیزر کے کالر کے اوپر ٹھیک کیا۔ سرخ بلیزر زرد رنگ پر خوب پھب رہا تھا۔ پیتل کے چمکیلے بٹنوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو ان کی ٹھنڈک نے جھنجھنائے اعصاب کو عجب سکون دیا۔ چھاتیاں کیونکہ بڑی نہ تھیں اس لئے بلیزر کے بٹن بند کر دینے سے وہ بالکل دب گئیں۔ پتلون کے بٹن بند کرتے وقت سکھ لڑکا مسکرا دیا۔

دنیا مسکرا دی! کائنات کھل کھلا اٹھی!!

اس کی نگاہیں مرحومہ ماں کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ اس سے پہلے وہ تصویر کے سامنے خود کو سکڑتے محسوس کرتی۔ وہ ماں کو خشمناک نگاہوں سے اپنی طرف گھورتے پاتی۔ وہ

خود کو مجرم سمجھتی۔ مگر اب نہیں! اسے پانچ فٹ ایک انچ کا قد چھ فٹ میں تبدیل ہوتا محسوس ہوا۔ ملائم گال اور نرم ٹھوڑی ڈاڑھی سے بھر چکی تھی۔ بالائی لب پر بالوں کی سرمئی لکیر بڑی بڑی مونچھوں میں تبدیل ہو چکی تھی اور سیاہ گھنے بالوں نے جسم کی ملائم جلد کو کرخت بنا دیا تھا۔ اس نے فاتح کی طرح سینہ تان کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پلک جھپکائے بغیر دیکھا اور دیکھتی رہی۔ پھر جو گھومی تو مینٹل پیس پر چاندی کے فریم میں رکھی بھائی جان کی تصویر سے آنکھیں ٹکرائیں۔ وہ بلیزر پہنے اور ہاتھ میں ریکٹ لئے بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ وہی بلیزر اب اس نے پہن رکھا تھا۔ اس نے تصویر کو یوں دیکھا گویا رائے کی منتظر ہو

اور پھر اس نے بھائی جان کی تصویر کا منہ چڑا دیا۔

جب اس سے بھی نہ تسکین ہوئی تو آنکھوں کو مزید ٹیڑھا کر کے اور پوری زبان نکال کر جتنا بھی ٹیڑھا ہو سکتا تھا کر لیا!

نعیمہ کیونکہ پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹے کے بعد پیدا ہوئی تھی اس لئے ماں نے بھی اس کی پروا نہ کی۔ کلیم کی پیدائش کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ چلو اب لڑکیوں کی پیدائش کا سلسلہ ختم ہوا اسی لئے تو پیدائش سے پہلے کلیم کے وزن پر لڑکے کا نام بھی نعیم سوچ لیا گیا۔ مگر جب خاص لمبی دردِ زہ اور تکلیف کے بعد نعیمہ پیدا ہوئی تو سارے گھر پر اوس پڑ گئی' کیونکہ چھٹی لڑکی تھی اس لئے دائی کو بھی محض دس روپوں پر ٹرخا دیا گیا اور یوں وہ بھی بڑبڑاتی ہوئی ناخوش گئی۔ باپ تھا تو وکیل مگر اتنا کامیاب نہیں کہ چھ بیٹیوں کے جہیز کا بار اٹھا سکتا یوں اس نے جھونجھل میں آ کر پہلی لڑکیوں کو پیٹ ڈالا۔ ماں نے پہلو میں لیٹی بچی کو دیکھا۔ سانولا رنگ تھا اور سیاہ بالوں کے گچھوں نے سر کو ڈھانپ رکھا تھا' آنکھیں بند تھیں اور چہرہ اور جسم سوجن سے پھولا پھولا۔ اس نے ایک لمحہ کو نقاہت سے اسے دیکھا مگر اس کے دل میں فخر و انبساط کے وہ احساسات نہ تھے جو کلیم کو اپنے پہلو میں دیکھ کر محسوس ہوئے تھے۔ اس چھٹی بچی کے لئے اس کے دل میں ماں تا کا چشمہ نہ پھوٹا بلکہ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا وہ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں بن مانگے آئی ہو۔

وکیل صاحب نے بیٹے کی پیدائش پر سب کو تار سے اطلاع دی تھی بلکہ ان کی ماں نے تار کھولے بغیر ہی اسے اپنی بہو کی موت کا سمجھ کر رونا بھی شروع کر دیا اور یوں

پوتے کی پیدائش ان کے لیئے شادی مرگ بنتے بنتے بچی۔ مگر نعیمہ کی پیدائش نے انہیں اتنا بدمزہ کیا کہ انہوں نے کسی کو کارڈ لکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی' الغرض تعویذوں' منتوں اور پیروں فقیروں کی دعاؤں سے پیدا ہونے والے کلیم کے بعد نعیمہ گھر میں بن بلائے مہمان جیسی تھی۔

کلیم گھر بھر کا کھلونا تھا۔ والدین اسے دیکھ کر نہال ہوتے' بہنیں واری صدقے جاتیں' دادی ڈھیروں کھلونے اور کپڑے لے کر آتی۔ آنے جانے والے سبھی رشتہ دار اس کے لیئے کچھ نہ کچھ لے کر آتے اور تھا بھی اتنا بابرکت کہ اس کے عقیقہ پر کئی لڑائیاں صلح میں بدل گئیں۔

کلیم نے جس دن باپ کو جوتا مارا سارا گھر کھل اٹھا اور محلّہ بھر میں اس شرارت کا تذکرہ کیا گیا۔ اس نے جب پہلی گالی دی تو ماں باپ کا بس نہ چلا ورنہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دیتے۔ وہ گھر میں آمر تھا اور چھ بہنوں پر اسے ہر لحاظ سے ترجیح دی جاتی۔ باقی پر تو اس لئے کہ وہ لڑکیاں تھیں اور نعیمہ پر اس لیئے کہ وہ کلیم کے بعد آئی تھی۔ کلیم اسے تنگ کرتا' اس کی چٹیا کھینچ لیتا' روٹی اٹھا پھینکتا' مکوں سے پیٹ ڈالتا مگر سارا گھر ہنستا رہتا۔

اب وکیل صاحب میں کیونکہ مزید سعی سے مزید خطرات مول لینے کی سکت نہ رہی تھی اس لئے غیر شعوری طور سے کلیم اور نعیمہ کو ایک پلڑے میں رکھا تھا اور ماں بیٹے کے معاملہ میں کسی بدنیت بنیئے کی طرح ڈنڈی ماردیتی۔

کلیم پالا جارہا تھا' نعیمہ پل رہی تھی۔

بڑھتی عمر اور شعور نے اسے باور کرادیا کہ لڑکا ہونے سے ہی اس کے وجود کا جواز تھا۔ اس کی یادداشت میں مختلف مواقع پر کہے گئے فقرات کانٹوں کی طرح چبھے ہوئے تھے۔

''منحوس! تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مرگئی۔''

''اے اللہ! یہ لڑکا ہوتی تو تیری جناب میں کیا کمی تھی۔''

''بے حیا! کلیم سے مقابلہ کرتی ہے؟''

''خبردار! کلیم کو کچھ کہا تو ہڈیاں توڑ دوں گی۔''

اسکول میں جامن کا درخت تھا۔ کافی اونچا! سیاہ جامنیں' اونچی اونچی شاخوں سے لڑکیوں کو گھورتی رہتیں اور ہوا سے ہلتی شاخیں پاس بلاتیں۔ نعیمہ بھی ان آنکھوں کے سحر کی شکار تھی۔ آدھی چھٹی ہوتی تو لڑکیوں کی ٹولیاں درختوں کے نیچے سے گری جامنیں چننے پر ہی اکتفا کر لیتیں۔ کھاتی تو نعیمہ بھی تھی مگر اسے مٹی لگی پچکی جامن کھانے کا مزا نہ آتا۔ کبھی کسی لڑکی نے درخت پر یوں چڑھنے کی کوشش نہ کی کہ درختوں پر چڑھنا لڑکیوں کا کام نہیں لیکن نعیمہ لڑکے لڑکی کی تفریق کی قائل نہ تھی۔ اس لئے ایک دن جب اس سے نہ رہا گیا تو چپل اتار اور دوپٹہ ایک سہیلی کے حوالہ کر کے وہ مرتی جیتی درخت پر جا چڑھی۔ خود بھی پیٹ بھر جامنیں کھائیں اور سہیلیوں کو بھی کھلائیں۔ جامن کھا کھا کر ان سب کی زبانیں سیاہ ہو گئیں۔ جب ناک منہ تڑائے بغیر وہ صحیح سلامت نیچے بھی اتر آئی تو وہ خود کو اپنی سہیلیوں سے کہیں زیادہ بلند و ارفع' ایک لڑکا محسوس کر رہی تھی۔ یوں بھی درخت کی بلندی سے جب اس نے جھانک کر نیچے دیکھا تو اپنی طرف للچائی اور بھوکی آنکھوں سے دیکھتی لڑکیوں کا جھرمٹ اسے بلیوں جیسا بے وقعت لگا تھا۔

جھولتی شاخوں پر رس بھری جامنوں کے گچھوں کے درمیان کھڑی نعیمہ کو یہ بھی یاد آیا کہ بھائی جان تو درخت پر بھی نہیں چڑھ سکتے۔

وہ اس وقت پانچویں جماعت میں تھی۔

اسکول میں سالانہ کھیل ہو رہے تھے۔ نعیمہ ان کھیلوں میں پیش پیش تھی۔ سو میٹر کی دوڑ سے لے کر ہر طرح کی چھلانگ میں اس کا نام تھا۔ گو اسے ایک سیکنڈ اور دو تھرڈ انعاموں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا لیکن وہ انعام کیلئے مقابلوں میں شریک نہ ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں تو صرف یہ خیال تھا کہ بھائی جان آج تک اسکول سے ایک دھیلہ بھی انعام میں نہ لائے تھے۔ وہ لڑکیوں سے مقابلہ نہ کر رہی تھی بلکہ کلیم کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ گو ہائی جمپ میں ٹخنے پر چوٹ آنے سے وہ کئی دن تک لنگڑا لنگڑا کر چلتی رہی لیکن اس کے لئے یہ بھی باعث افتخار تھا۔ بھائی جان نے تو آج تک کسی طرح کی بھی چوٹ نہ کھائی تھی۔ جب انسپکٹریس کے ہاتھوں اس نے لال نیلے پیلے کاغذوں میں لپٹے اور سنہری گوٹے میں بندھے انعامات (تولیہ' صابن اور ربن) وصول کیے تو اس کی

سہیلیوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

گھر والے بھی اب مرعوب ہوتے جا رہے تھے۔

وہ اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی۔

ایک شام!

کلیم اور وہ اکٹھے سالن لینے کے لئے باورچی خانہ میں بیٹھے تھے۔ ماں سالن تھالیوں میں ڈال رہی تھی اور نعیمہ کی نگاہیں ڈوئی میں جانے والے شوربہ ہی کو نہ تول رہی تھیں بلکہ آلو اور بوٹیاں بھی گن رہی تھیں۔

کلیم کی تھالی میں ایک بوٹی زیادہ تھی۔ نعیمہ نے ادھر ہاتھ بڑھا دیا۔

''یہ میری ہے۔'' کلیم فوراً بولا۔

''کیوں؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''اس پر تمہارا نام لکھا ہے کیا۔''

کلیم نے ماں کی طرف نقش فریادی بن کر دیکھا اس پر اسے مداخلت کرنا پڑی۔

''ہاں نعیمہ! تم وہ تھالی کیوں نہیں لے لیتیں' یہ تو کلیم کی ہے۔''

مگر وہ خاموشی سے تھالیوں میں پڑے ہوئے آلوؤں اور بوٹیوں کے حجم کو دیکھتی رہی۔ اس پر ماں چڑ کر بولی۔ ''لیتی کیوں نہیں؟''

''میں نہیں لوں گی۔''

''مگر کیوں؟''

''اس میں ایک بوٹی کم ہے۔''

ماں نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ ''تیری یہ مجال! کھلاتے پلاتے اتنا لالچ؟ کھانا ہو تو کھاؤ' ورنہ بھاگ جاؤ۔''

وہ خاموشی سے اٹھ آئی' مگر ناگن کی طرح بس گھول رہی تھی۔ کلیم نہ صرف اس کی بوٹیاں کھا رہا تھا بلکہ ماں کی آنکھ بچا کر اس کی طرف دیکھ دیکھ کر منہ چڑانے والے انداز میں ہنستا بھی رہا۔

وہ اس وقت نویں جماعت میں تھی۔

جب معمولی سی علالت کے بعد ماں کا انتقال ہو گیا تو گو وہ بھی سب کے ساتھ ہی

روئی، روئی کیا رو رو کر آنکھیں سرخ کر لیں، مگر جلد ہی اسے بھول گئی۔ کیونکہ اب اسے اور کلیم کو ایک ترازو میں بٹھانے والی نہ رہی تھی۔ اس لئے اب وہ گھر میں چھوٹی ہونے کے باوجود بھی اپنے انداز سے وقت گزار سکتی تھی۔ بیوی کی وفات کے بعد وکیل صاحب گھر کے معاملات سے بالکل ہی لاتعلق ہو گئے۔

وہ اس وقت دسویں جماعت میں تھی۔

وہ کالج میں داخل ہوئی تو فرسٹ ایئر کی دیگر لڑکیوں کی طرح سکڑی سہمی اور لجائی لجائی نہ پھر رہی تھی۔ جب ایک لڑکی نے برقع کے ساتھ پین کی سیاہی صاف کرنے کی کوشش کی تو اس نے بپھر کر اس کی چٹیا پکڑ لی۔ اس پر قہقہے لگانے کو لڑکیوں کی ٹولی کھڑی تھی مگر یہ طلسم ہوشربا دیکھ کر ان سب کے رنگ اڑ گئے۔ لڑکی نے کھسیانی ہو کر کہا۔

''کالج میں آئی ہو تو تمیز سیکھو۔''

نعیمہ نے چٹیا کو جھٹک کر صرف ایک لفظ کہا۔ ''کتیا''

لڑکی نے بے بسی سے اپنی ساتھیوں کو دیکھا۔ ٹولی کی لڑکیاں کہہ رہی تھیں۔

''وحشی!''

''گنوار۔''

''جنگلی بلی!''

اس نے ایک مرتبہ اور جھٹکا دیا اور پھر چٹیا گھما کر اسے یوں دھکا دے کر چھوڑا کہ وہ گرتے گرتے بچی، وہ ایڑیوں کے بل گھوم کر تماشہ دیکھنے والیوں سے مخاطب ہوئی۔

''میرے ساتھ کسی نے بکواس کی تو جوتے مار مار کر منہ لال کر دوں گی۔''

لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے سامنے قوس کی صورت میں کھڑی لڑکیوں کو کائی کی طرح پھٹتے دیکھا تو فاتحانہ لہجہ میں بولی۔ ''جنگلی بلی نہ کہو بلکہ جنگلی بلا۔'' سب خاموشی سے چلی گئیں، یہ بڑبڑائی۔ ''چوہیاں۔''

گھر آ کر اس نے بارہ مصالحے ملا کر ایک مزیدار چاٹ بنا کر یہ بات سنائی اور پھر کلیم کی طرف چبھتی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''آپ کو بھی تو لڑکوں نے خوب فول بنایا تھا۔'' انداز ایسا تھا گویا کہہ رہی ہو، تو بھلا آپ کو فول بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی!

کلیم خاموش رہا۔ کیونکہ پہلے دن لڑکوں نے اسے غلط کمروں ہی میں نہ بھیجا بلکہ سائیکل کی گھنٹی اور آئینہ بھی اتار لیا تھا۔ کلیم کو اپنی سائیکل جان سے بھی پیاری تھی۔ وہ روزانہ اسے صاف کر کے تیل دیا کرتا تھا اور سیاہ مڈگارڈ تو آئینہ بنے رہتے۔ جب وہ کالج سے منہ لٹکائے آیا تو بہنوں نے کالج کے لڑکوں کو خوب کوسا۔ نعیمہ اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اس کی چڑ ہی یہ بنالی۔ ذرا کسی بات پر اکڑا اور اس نے نعرہ لگایا!

"فرسٹ ایئر فول۔"

اب جو اس نے کلیم سے چبھتے لہجے میں بات کی تو بڑی بہن ہنس کر بولی۔ "تم اس بیچارے کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہو۔"

"میں کاہے کو ان کے پیچھے پڑتی۔" نعیمہ نے جواب دیا۔ "ان کے کام ہی ایسے ہیں۔"

کلیم جل کر بولا۔ "اب تمہاری طرح میں ہر ایک سے لڑنے مرنے سے تو رہا۔"

"آ ہاہاہا!" وہ لہک کر بولی۔ "لڑنے کے لئے دل ہونا چاہیے۔ بھائی صاحب!"

اس نے بھائی صاحب اس مضحکہ خیز لہجہ میں کہا کہ سبھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ کلیم سرخ ہو گیا' نعیمہ نے لوہا گرم دیکھا تو ایک اور چوٹ لگائی۔ "نہ جانے آپ کیسے مرد ہیں۔"

کلیم کے ہونٹوں کے کونے کپکپا کے رہ گئے۔ ایک بہن نے سہارا دیا۔ "یہ کہاں مرد ہے اصل مرد تو تم ہو۔"

دوسری نے کہا "نہ جانے اللہ میاں نے تمہیں کیوں عورت بنا دیا۔ تم میں کوئی بات بھی تو عورتوں والی نہیں۔"

یہ فقرے اس کے لئے ٹانک تھے' خوشی سے چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور گردن یوں تان لی گویا دس فٹ نو انچ لمبے شیر کے سینہ پر پاؤں رکھ کر تصویر اتروا رہی ہو۔

کالج میں جلد ہی اس کے ٹور بن گئے۔ اسکول میں تو مرجی کر کچھ نہ کچھ پڑھ ہی لیتی تھی لیکن کالج کی دلچسپیوں نے تو کتابوں سے اس کا دل بالکل اچاٹ کر دیا۔ وہ پڑھائی کے علاوہ باقی ہر معاملہ میں پیش پیش ہوتی تھی۔ کھیلوں میں وہ آگے! تقریروں میں وہ آگے!! یونین میں وہ آگے!!!

اس کے انداز واطوار میں دن بدن مردانہ پن پیدا ہوتا جا رہا تھا۔لڑکیاں اسے ''غنڈی'' کہتی تھیں۔اسے بھی معلوم تھا لیکن چڑنے کی بجائے اس نے اپنے لئے خطاب جانا۔چند خالص لڑکیاں اس کی حلقہ بگوش تھیں جن پر وہ خوب رعب جھاڑتی' ان کی بے عزتی کرتی اور جسے بغاوت پر آمادہ دیکھتی اسے حلقہ سے نکال باہر کرتی۔

ریڈ کراس ویک کے لئے کالج میں ورائٹی شو کا پروگرام بن رہا تھا۔یہ سٹیج پر آ کر ناچنے گانے کے سخت خلاف تھی۔کسی مذہبی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ یہ خالص ''زنانہ'' کام تھا۔اس کی آواز اتنی بھاری تھی کہ اس نے کبھی غسل خانے میں بھی گنگنانے کا نہ سوچا' رہا ناچ تو کسی فلمی ریکارڈ پر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے اور کھسروں کی طرح کمر مٹکانے کے مقابلے میں وہ جیولین تھرو کو زیادہ معزز کام سمجھتی تھی۔

جب ورائٹی شو کا نوٹس لگا تو سارے کالج میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی

''تم نہ جاؤ گی؟'' کسی نے پوچھا۔

''میں کنجروں والا کام نہیں کرتی۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''اس میں کنجروں کے کام والی کیا بات ہے۔''

''اور کیا۔'' وہ منبر پر کھڑے مُلّا کی طرح ہاتھ ہلا کر جلال میں آ کر بولی۔''ناچنا گانا شریف لڑکیوں کا کام ہے کیا؟''

''تو یہاں کون سے مرد ہوں گے۔''

یہ بولی''اور پھر ان مردوں کو کیا پتہ ان باتوں کا۔''

''کن باتوں کا؟''

''ان ہی باتوں کا۔''اس نے اس پراسرار لہجہ میں کہا کہ سب کے چہرے سوالیہ فقرہ کا نشان بن گئے۔

ورائٹی شو میں ایک ون ایکٹ پلے بھی تھا۔قدیم داستانوں ایسا پلاٹ جس میں شہزادی اور شہزادے کی محبت کو دغا باز وزیر اپنی مکارانہ چالبازیوں سے ناکام بنانے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن انجام اس کا ہی خراب ہوتا ہے۔شہزادی اور شہزادے کے کردار کی ادائیگی کے لئے تو دو کومل سی لڑکیاں مل گئیں۔بادشاہ اور ملکہ بننے کے لئے بھی دو موٹی

تازہ لڑکیوں سے کام چلا گیا لیکن دغاباز وزیر کے لئے کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہ مل رہی تھی۔ انچارج پروفیسر بہت پریشان تھی۔ کردار مرکزی اہمیت رکھتا تھا اس لئے وہ موزوں ترین لڑکی چاہتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے نعیمہ کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے عجب لاپرواہی سے دوپٹہ لٹکائے جاتے دیکھا۔ وہ اس کی کلاس میں تو نہ تھی لیکن کھیلوں اور یونین کی وجہ سے وہ اسے پہچانتی تھی۔

''نعیمہ!'' اس نے آواز دی۔

پہلے نعیمہ کے قدم رکھے پھر اس کی گردن گھومی پھر سارا دھڑ گھوما اور جب دیکھا کہ پروفیسر بلا رہی ہے تو دو قدموں میں وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ''جی!'' وہ اپنی گونج دار آواز میں بولی۔

پروفیسر اس کے چوڑے چہرے' چھوٹی آنکھوں اور بھاری ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ نعیمہ یوں خود پہ نظریں دوڑتی محسوس کر کے جھینپے بغیر کسی سپاہی کی طرح اٹنشن کھڑی تھی۔

''تم ڈرامہ میں کام کرو گی؟'' اس نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے بھی کسی تمہید کے بغیر انکار کر دیا۔

''دیکھو یہ بہت اہم کردار ہے اور کئی دنوں سے میں اس کے لئے لڑکیوں کو ٹسٹ کر رہی ہوں۔''

''میں نے کبھی ڈرامہ میں کام نہیں کیا۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے تم ڈبیٹر ہو' یونین کی جائینٹ سیکرٹری ہو......ہو نا؟''

''جی!''

''اصل چیز اسٹیج کا ڈر ہے جب وہ نہیں تو باقی سب کچھ میں ریہرسلوں میں ٹھیک کر لوں گی۔''

''کیا کردار ہے؟'' اس نے دلچسپی لئے بغیر پوچھا۔

''میل کیرکٹر ہے' ایک سازشی اور دغاباز وزیر......'' جب اس نے کردار کے تمام اوصاف سنے تو اسے بھی دلچسپی ہو گئی اور کام کرنے پر رضامند ہو گئی۔ چلتے وقت پروفیسر نے

اس کے پاؤں کو دیکھا' اور ہنس کر پوچھا۔
''کیا نمبر ہو گا تمہاری جوتی کا۔''
''وہ شرمائے بغیر بولی''تو...... ہوسکتا ہے دس ہی ہو مگر آپ کیوں پوچھتی ہیں۔''
''ڈرامہ میں ایک موقع پر تمہیں لات بھی مارنی ہے۔'' وہ خوش ہو کر اس کے پاؤں دیکھتی رہی اور پھر داد دینے کے انداز میں بولی۔''تم تو بنا بنایا دغاباز وزیر ہو۔''

نعیمہ نے دل لگا کر تمام مکالمے رٹ لئے اور چند ہی ریہرسلوں کے بعد اس کی آواز ہال کے آخری کونے تک پہنچ رہی تھی۔ پروفیسر بہت خوش تھی۔ایک دن ریہرسلوں کے بعد کہنے لگی۔''اگر تم اسی طرح محنت اور شوق سے کام کرتی رہیں تو پہلا انعام تمہارا ہی رہے گا۔''

نعیمہ کے شوق کا تو یہ عالم تھا کہ بہنوں اور سہیلیوں کے ساتھ باتوں کی بجائے ڈائیلاگ بولتی اور ایک دن تو حد ہوگئی۔باپ نے کسی بات پر ٹوکا تو وہ خونی وزیر کے لہجہ میں کڑک کر یہ کہتے کہتے رہ گئی۔
''خاموش! ناہنجار!!''

شو والے دن اس کی حالت عجیب تھی اور اعصاب میں تناؤ۔لیکن گرین روم میں پہنچ کر وہ مکالمے بھولنے کا خوف اور ناکام رہنے کے خدشات سب کچھ بھول گئی۔سب لڑکیاں اپنے اپنے میک اپ میں مصروف تھیں۔ باتوں اور چہلوں سے اپنی پریشانی چھپانے کی کوشش بھی ہو رہی تھی۔ساٹن کے سرخ لہنگا سیٹ میں شہزادی شعلہ بن رہی تھی۔ وہ اسے بہت پیاری لگی اتنی پیاری کہ اس نے کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بازوؤں میں لے لیا۔''میری شہزادی!'' اس نے مکالمہ ادا کیا اور پھر ایک گھٹنہ زمین پر ٹیک کر اور دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔''شہزادی! میں دنیا بھر کی خوشیاں ان نازک قدموں پر نچھاور کر دوں گا۔''

شہزادی سچ مچ شرما گئی۔اس پر بروکیڈ کی شیروانی میں ملبوس اور آئی برو پنسل سے تلوار مار کہ مونچھیں بنائے شہزادہ بولی۔''اے میاں وزیر! ذرا میری شہزادی سے دور ہی رہو۔''

شہزادہ کی شیروانی سے چھاتیوں کے ابھار کا اندازہ ہوتا تھا۔نعیمہ نے فوراً چوٹ

کی۔ ''میاں شہزادے! اپنا ٹریڈ مارک تو سنبھالو۔''

اس پر خوب قہقہہ لگا۔

اتنے میں پروفیسر بھی آ گئی اور یوں یہ چُہل بازی ختم ہوئی۔ گو نعیمہ کی چھاتیاں ضرورت سے بڑی نہ تھیں پھر بھی اس نے ایک چوڑا کپڑا خوب کس کر باندھا۔ شیروانی اور نیچے چوڑی دار پاجامہ پہنا کر پروفیسر نے اس مہارت سے پگڑی باندھی کہ سر کے تمام بال چھپ گئے۔ بکرے کے بالوں سے ٹھوڑی پر ڈاڑھی لگا کر آئی بروپنسل سے آنکھوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھریاں بنائی گئیں۔ گلے میں سفید رنگ کے چھوٹے موتیوں کا ایک ہار اور پاؤں میں سفید سلیم شاہی (اس کے چوڑے پاؤں کے لئے 9 نمبر کی سلیم شاہی مشکل سے مل سکی تھی) میک اپ مکمل ہوا تو پروفیسر نے عینک میں سے چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کو گھما کر ناقدانہ جائزہ لیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بالآخر بولی۔

آئینہ میں تبدیلِ ہیئت کا نظارہ کر کے نعیمہ ششدر رہ گئی۔ خود کو ٹریڈ مارک کے بغیر دیکھ کر اس پر عجیب خوشگوار اثر ہوا۔ ڈاڑھی اور پگڑی نے اسے ایک مدبر شخصیت بنا دیا تھا۔ ڈرامہ کیونکہ آخر میں تھا اس لئے وہ ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ آج اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب اس نے خالی گھر میں پہلی مرتبہ مردانہ لباس زیب تن کیا تھا۔ اس دن وہ کیسے حواس باختہ تھی اور آج کتنی مطمئن!

اسٹیج پر قدم رکھا تو ابھی پردہ نہ اٹھا تھا۔ تمام کاسٹ اپنے اپنے مقام پر قدرے سہمی سی کھڑی تھی۔ پردے کے پیچھے ہال سے بھانت بھانت کی عورتوں کی باتوں کی گونج ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ ''تخت'' کے بائیں جانب دھڑکتے دل سے کھڑی تھی۔ ادھر پروفیسر ایک کونے میں ڈرامہ کا مسودہ لیے بیٹھی تھی۔ پروفیسر نے ان سب پر آخری نگاہ ڈالی اور مطمئن ہو کر پردہ اٹھنے کی گھنٹی بجا دی۔ فٹ لائٹس سے روشنی کا سیلاب جو چھوٹا تو سب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ نعیمہ نے ہال میں بیٹھی اپنی بہنوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر روشنی کی جلتی لکیر سے آگے نہ دیکھا جا سکتا تھا۔ پردہ اٹھنے پر دل کی دھڑکن کی جگہ اب ایک عجیب سے سکون نے لے لی تھی۔ اس پر مستزاد یہ احساس کہ باقی سب تو احمق لڑکیاں ہیں میں ہی

ان میں حقیقی مرد ہوں۔ یوں اس نے خود میں کسی الف لیلوی وزیر کی روح تحلیل ہوتی محسوس کی۔اس نے ذرا حلق پر زور دیا تو بھاری آواز میں مردانہ گونج پیدا ہوگئی' اور چند مکالموں کے بعد وہ خود کو واقعی ایک وزیر سمجھ رہی تھی۔ تمام کاسٹ میں سب سے کم وہی مکالمے بھولی۔ ایک موقع پر اس نے کڑک کر خشونت آمیز لہجہ میں مکالمے ادا کیے تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جب شہزادی کو تھپڑ مارنے والا منظر آیا تو اس نے وہ حقیقی تھپڑ رسید کیا کہ شہزادی کے حقیقی آنسو نکل آئے اور اگلی قطار میں بیٹھی خواتین نے اس کے گال پر انگلیوں کے نشانات ابھرتے دیکھے۔

شو ختم ہوا تو پروفیسر نے خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ پرنسپل صاحبہ نے اسے کامیاب اداکاری پر مبارک باد دی اور سہیلیاں تو اسے چھوڑتی ہی نہ تھیں اور جب اخباروں کے زنانہ صفحات کے تبصروں میں تصویر چھاپ کر اس کی اداکاری کو سراہا گیا تو تمام بہنوں پر اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب میں' تالیوں کی گونج میں' تقریروں اور کھیلوں کے انعامات کے ساتھ ساتھ بہترین اداکاری کا کپ بھی ملا۔

کمرہ کی کھڑکی کھلے تو سامنے کچھ فاصلے پر ایک لڑکی کھڑی نظر آتی ہے۔ گو فاصلہ کی وجہ سے اس کے نقوش کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن چہرہ کے نمک اور چٹیا کی لمبائی کا ضرور احساس ہوتا ہے۔ لڑکی جوان ہے۔ جسم بھی بھرپور ہے۔ وہ وقت کے اندازے سے کوٹھے پر آتی ہے اور پرامید نظروں سے کھڑکی کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر بعد نیلے پردے والی کھڑکی میں ایک لڑکے کی شبیہہ ابھرتی ہے۔ لڑکی کھل اٹھتی ہے۔ لڑکا جھک کر تسلیم بجا لاتا ہے اور لڑکی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتی ہے۔ لڑکی نے گو ابھی تک لڑکے کو قریب سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی پیغام الفت ملا لیکن پھر بھی چند دنوں کی اس توجہ نے اس کے من میں سپنوں کے پھول کھلا دیے۔ اس کی 23 سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی لڑکے نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ اس لئے وہ خوش ہے' مگن ہے۔ کوٹھے پر اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ نیچے سے ایک بچہ اٹھا لاتی ہے' اسے گدگدیاں کرتی ہے' ساتھ لپٹاتی ہے۔ بھینچتی ہے اور چٹاخ پٹاخ اس کا منہ چومتی ہے۔ ہنستی ہے اور پھر چومتی ہے

پھر ہنستی ہے اور پھر چومتی ہے۔

لڑکا ان تمام حرکات کو دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا ہے اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے مگر کان اپنے کمرہ کے بند دروازہ کی طرف لگے ہیں۔ اتنے میں نیچے سے آواز آتی ہے۔

''نعیمہ!''

کوٹھے پر کھڑی لڑکی کو آخری سلام کر کے وہ کھڑکی بند کر کے کہتی ہے۔''جی!'' مشاق انگلیاں تیزی سے بش شرٹ کے بٹن کھول رہی ہیں۔

''جمیلہ آئی ہے۔ نیچے آؤ۔''

''ابھی ایک منٹ میں!''

چٹخنی کھول کر نیچے ڈرائنگ روم میں جاتے وقت نعیمہ نے بند کھڑکی کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

محمد طارق اقبال ڈیجیٹل داستانیں ڈاٹ کام

بسیرے دی جورو

بسیرے کی جورو کو پہلی مرتبہ دیکھ کر میرے ذہن میں پہاڑ کا تاثر پیدا ہوا تھا اور یہ تاثر ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ لازم وملزوم ہو کر رہ گیا۔ اس حد تک کہ اگر پہاڑ دیکھ لوں تو مجھے فوراً بسیرے کی جورو یاد آ جاتی ہے۔ وہ تھل تھل کرتے گوشت کا پہاڑ تھی۔ چھ فٹ کے سانچے میں تین چار من گوشت فٹ کر دیں تو یہ بسیرے کی جورو ہوئی اور پھر آواز ایسی گونجیلی جیسے کھوہ سے نکل رہی ہو۔ طباق سا چوڑا چہرہ بیلنے ایسے بازو اور تانبے ایسی رنگت۔ اسے دیکھ کر روایتی ایمیزان عورتیں یاد آتی ہیں۔ اگر ناروے میں ہوتی تو وایکنگ کا خطاب پاتی' روس میں ہوتی تو کے بی جی کی بڑی کامیاب ایجنٹ ہوتی۔ امریکہ میں ہوتی تو اپنے ''ون وومن شو'' پر خود ہی ٹکٹ لگا کر امیر بن جاتی لیکن افسوس کہ اس مملکت خداداد میں اس کی تمام صلاحیتیں بیکار جا رہی تھیں۔ نہ وہ بکنی میں اپنا شو لگا سکتی تھی اور نہ کرائے کا ہاتھ مار کر کسی کی گردن توڑ سکتی تھی۔ لیکن ایک بات ہے کہ پورے محلے میں اس کی دھاک بیٹھی تھی۔ کیا مجال جو کوئی عورت اس کے سامنے زبان کھول جائے یا کوئی بچہ چوں کر جائے' اور تو اور' اس کے مجازی خدا یعنی مسٹر بشیر کو بھی اس کے سامنے دم مارنے کی تاب نہ تھی۔ ویسے تو اس مچھر صفت آدمی میں کسی بات کی بھی تاب نہ تھی...... ان دونوں کے نسبت تناسب کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ اگر پہاڑ تھی تو یہ پہاڑ کے بل میں دبکا چوہا۔ پھر چوہے ایسی لمبی تھوتھنی پر ٹوتھ برش جیسی مونچھوں اور باورچی خانہ کی دھوئیں سے رنگی دیوار جیسی رنگت سے وہ واقعی چوہا ہی معلوم ہوتا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں اس کے سو سوا سو پونڈ کے جسم کو

جھولتے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا گویا ہینگر پر لٹکے کپڑے بل رہے ہیں۔ بلکہ مجھے تو وہ خود ہی بیوی کے ہینگر پر لٹکا کپڑا الگتا تھا۔

وہ عام محلوں جیسا گندہ محلہ تھا۔ وہاں غریب غرباء رہتے تھے اس لئے اور بھی گندہ رہتا۔

گندگی سے ابلتی نالیاں' کوڑے کے ڈھیر پر بھنبھناتی مکھیوں جیسے بچے' عورتیں سارا دن اپنے دروازوں پر بیٹھی گھر کا کام کرتیں' باتیں کرتیں' لڑتیں اور تازہ ترین سکینڈلوں پر تبصرے کرتیں۔ کبھی کبھی کمیٹی والے غلطی سے آ کر کوڑا اٹھا لیتے یا نالیاں صاف کر جاتے تو لینڈ سکیپ یوں بدل جاتا کہ الجھن ہونے لگتی۔ اسی طرح اگر دو چار دروازے بند نظر آتے تو گلی کی خاموشی سی وحشت ہوتی۔

میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ جس کے سامنے کی تین فٹ کی گیلری میں دبکا جالیوں میں سے ساری گلی کی باتیں سنتا تھا۔ میری گیلری کے نیچے نلکہ تھا اور میرے کمرے کے عین نیچے بسیرا اور مسز بسیرا کے دو کمرے تھے' بسیرا نلکوں کی مرمت کا کام کرتا تھا اور اس نے کمیٹی کے پائپ کو کاٹ کر یہ نلکہ لگایا تھا جس سے سارا محلہ سیراب ہو رہا تھا۔ یہ نلکا کیا تھا سارے علاقے کا نروسنٹر تھا۔ بھانت بھانت کی عورتیں ٹین کنستر اٹھائے آتیں اور گپ شپ لگا کر جاتیں۔

میں ان دنوں بیکار تھا۔ اس لئے آہوں اور سسکیوں کی چاشنی میں ڈوبے انتہائی رومانی افسانے لکھا کرتا تھا۔ جب آوارہ گردی سے تھک جاتا تو سارا سارا دن ان عورتوں کی باتیں سننے میں گزار دیتا۔ اگرچہ ان گندی غلیظ عورتوں کی گفتگو میری شائستہ اطوار ہیروئنوں کے لئے موزوں نہ تھی لیکن یہ میں اپنے لئے سنتا تھا۔ اتنی گندی گفتگو اتنے کھلے الفاظ میں ہوتی تھی کہ بس مزا آ جاتا' پتہ نہیں ان عورتوں کو دس فٹ اوپر میری موجودگی کا علم تھا یا نہیں۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اگر انہیں معلوم تھا بھی تو انہوں نے آواز دبا کر بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی حتیٰ کہ جب میں نظریں جھکائے بالٹی لئے آتا تو اس وقت بھی وہ چپ نہ ہوتیں۔ شاید وہ مجھے قطعی طور سے بے ضرر سمجھتی ہوں۔

جب میں پہلے دن نلکے پر پانی لینے گیا تو بالوں سے بھری پنڈلیوں تک شلوار

چڑھائے نلکے کے پتھر پر رگڑ رگڑ کر ایڑھیاں صاف کرتی بسیرے کی جورو کو دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ وہ بڑے انہماک سے ایڑیاں رگڑے جا رہی تھی۔ جب اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو ایڑیاں رگڑنی بند کیے بغیر پانی بھرنے کا اشارہ کر دیا مگر میں پانی کہاں سے بھرتا۔ نلکے کے نیچے تو وہ اپنا گوشت پھیلائے بیٹھی تھی۔ جب اس نے مجھے گومگو کے عالم میں دیکھا تو میرے ہاتھوں سے بالٹی لے کر اسے دو انگلیوں میں لٹکایا اور بھر کر مجھے پکڑا دی۔ جس بالٹی کو لے کر چلتے وقت میں قوس بنا جا رہا تھا اسے اس نے یوں پکڑ کر بھرا تھا کہ بازو میں خفیف سی لرزش بھی نہ ہوئی تھی۔

ایک تو میں بیکار دوسرے میں جوان اور تیسرے میں رومانی افسانہ نگار۔ اس لیے مجھے اس سے خوف آنے لگا حالانکہ اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہ تھی، میں کوئی گلی کا بچہ تو نہ تھا جو اس کی للکار سے ہراساں ہوتا۔ میں تو اس کا بسیرا بھی نہ تھا لیکن اس کے موٹے موٹے ہاتھ، مگدر ایسی پنڈلیاں اور ڈھیلے کرتے میں سے تھل تھل کرتا پیٹ دیکھ کر میں گھبرا جاتا۔ چنانچہ کوشش کرتا کہ جب وہ نلکے پر ہو تو میں وہاں نہ جاؤں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نصف زندگی اسی نلکے پر گزرتی ہے۔ کوئی اولاد بھی نہ تھی، اس لیے بال بچوں کے سلسلے کی پیدا ہونے والی بہت سی لایعنی مصروفیات سے وہ آزاد تھی۔ میں نے اس کے خوفناک تصور سے خود کو آزاد کرانے کے لئے اس پر ایک افسانہ لکھنا چاہا لیکن نازک اندام دوشیزاؤں کی تصویر کشی پر اٹھنے والا قلم اس سچ مچ کی عورت کو قابو میں نہ کر سکا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے تصور کو زیر نہ کر سکا تو بسیرے کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ شاید اسی لئے وہ صبح کا گیا رات کو واپس آتا تھا۔ میرا فرش ان کی چھت تھا مگر میں نے کبھی اس نیک بخت شوہر کی آواز نہ سنی اور سنتا بھی کیسے کہ اس کی منمناتی آواز تو نلکا بھی نہ پار کر سکتی تھی۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میں اسے غصے میں کسی سے لڑتا دیکھوں۔ میرے ذہن میں اس کے تن و توش کا ایک ہی مصرف تھا کہ سانڈ کی طرح اسے کسی سے بھڑا دیا جائے۔ ایک دن وہ صغراں کو اپنی ایک ایسی لڑائی کا حال سنا رہی تھی جس میں اس نے حریف کی قمیص تار تار کر دی تھی اور اس کے دانتوں سے خون نکال دیا تھا۔ اس نے جس انداز سے لڑائی کا حال بیان کیا اس سے مجھے افسوس ہوا کہ میں یہ سہانا منظر دیکھنے سے محروم رہا۔

ایک دن میں کمرے میں لیٹا تھا کہ نیچے گلی میں شور ہوا۔ایک آدمی کی غصیلی آواز کے جواب میں بسیرا ممیا رہا تھا۔ میں فوراً نیچے اتر آیا تو دیکھا ایک پہلوان نما مرد تیل سے بال چپڑے، تریزوں والا کرتا پہنے خالص لاہوری لہجے میں بسیرے کو گالیاں دے رہا تھا۔

معلوم ہوا کہ بسیرے نے جوئے میں کچھ رقم ہاری تھی جسے پورا کرنے کے لئے نلکوں کے اس ٹھیکیدار سے قرض لیا جس کا وہ کئی ماہ گزرنے کے بعد اب تقاضا کر رہا تھا۔اس نے عورتوں اور بچوں کی بھیڑ میں مجھے غالباً پڑھا لکھا سمجھ کر اردو میں مخاطب کیا۔''آپ خود ہی دسو جی، چھ مہینے ہونے کو آئے۔ پچاس روپے ڈکارے بیٹھا ہے۔آپ خود ہی سوچو جی۔''

پیشتر اس کے کہ میں سوچتا بسیرے کی جورو آ گئی۔مگر وہ آئی تو بعد میں، اس سے پہلے اس کی آواز آ گئی۔وہ نکڑ پر صغراں کے مکان سے آ رہی تھی۔''اوٹھہر تو جا، حرام دے جنے۔''

دراصل یہ میں نے سلیس اردو میں ترجمہ کر دیا ورنہ اس نے تو کچھ اور ہی اشلوک بولے تھے۔میدان جنگ تک پہنچتے پہنچتے وہ غصے سے سرخ ہو رہی تھی، ماتھا پسینے سے بھیگ رہا تھا اور قمیص کی اڑسی آستینوں سے نکلے بازو ہتھیار معلوم ہو رہے تھے۔اس نے آتے ہی ایک نظر میں صورتحال کو بھانپ لیا اور پہلوان کو دھکا دے کر بولی۔''کی گل اے؟''

''چین جی......'' پہلوان یوں بولا جیسے وہ ایک غبارہ ہے جس میں سے ہوا نکل جا رہی ہے۔

''چین ہو گی تیری ماں، میں تاں بسیرے دی جورو آں، بسیرے دی جورو۔'' اس نے کڑک کر کہا۔اس نے بسیرے کو دھکیل کر پیچھے کیا جو نالی میں گرتے گرتے بچا اور خود سینہ تان کر بولی۔''ہن بول او غنڈیا! کی گل اے؟''

''او جی گل تے کج نئیں جی۔''

''تے ایویں بک بک لگا رکھی اے۔''

''او چین جی......''

''خبردار۔ جے مینوں چین آکھیا۔ چین ہو گی تیری......'' اور اس نے پہلوان کی

بہن کو وہاں جا بٹھایا جہاں کوئی پہلوان اپنی بہن کو بٹھانا پسند نہیں کرتا۔ اب محلے کی باقی عورتوں نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ پہلوان سخت پریشان نظر آ رہا تھا۔ ادھر بسیرا کھڑا تھر تھر کانپے جا رہا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے خاموشی سے میرا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں چڑھ کر میرے کمرے میں آ گیا۔ نیچے سے عورتوں کا ملا جلا شور آ رہا تھا جس میں کبھی کبھی پہلوان کی آواز بھی بلبلے کی طرح ابھرتی۔ بسیرے نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

''تم پہلوان سے اتنا ڈرتے ہو؟''

''او جی اس سے کون ڈرتا ہے۔''

''تو پھر......؟''

''جی! جی!'' وہ کانپ کر بولا۔

نیچے گلی میں ایک دم خاموشی چھا گئی اور پھر آواز ابھری۔ ''بسیرا کدھر مر گیا؟''

اور بسیرا یہ آواز سنتے ہی جیسے سچ مچ مر گیا۔

جب دروازے پر پہلا دھماکا ہوا تو بسیرے کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ میں کنڈی کھولنے اٹھا تو بسیرے نے مجھے جن نظروں سے دیکھا' الفاظ میں ان کا بیان ناممکن ہے۔ کنڈی کھولنے سے پہلے ہی اس کی آواز گونجی۔ ''ماں دیا کھسماں بن پیو کولوں چھپ گیاں ایں۔''

دروازہ کھولا تو اس کے پیچھے عورتوں اور محلے کے بچوں کا لشکر نظر آیا اور وہ ان کے سر پر کھڑی واقعی ایمزان نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ کیسے ہو گیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ اس نے گریبان سے پکڑ کر بسیرے کو یوں اوپر اٹھا لیا جیسے شکاری کانوں سے پکڑ کر خرگوش کو اٹھا لیتے ہیں۔ بسیرے کے منہ سے میاؤں سے مشابہہ کچھ آوازیں نکلیں لیکن میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا' ہو سکتا ہے وہ میرے ہی حلق سے نکلی ہوں۔ اگلے لمحے بسیرا کمرے کے کونے میں سسک رہا تھا اور دوسرے لمحے وہ سیڑھیوں میں سے لڑھکتا ہوا نظر آیا۔ سب عورتیں ہائے ہائے کر رہی تھیں۔ بچے خوش ہو رہے تھے اور یہ طلسم ہوشربا قسم کا منظر دیکھ کر رومانی افسانہ نگار کپکپا رہا تھا۔

اب تمام گلی ان کے دروازے پر جمع تھی مگر مجھ میں ایک شوہر کی گت بنتے دیکھنے کی تاب نہ تھی سو پانی کا ایک گلاس پی کر اعصاب کو حالت سکون میں کیا۔ آئینہ دیکھا تو گال پر نیل نظر آیا مگر کوشش کرنے بھی یہ یاد نہ آیا کہ میرے گال پر یہ نیل کیسے آ گیا۔

شام کو وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی۔ وہ دروازے میں جھجکی سی کھڑی تھی۔

میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

''وہ......وہ...... ٹھیک ہے؟''

''کیوں؟'' میں سمجھ تو گیا تھا لیکن پھر بھی پوچھا۔

وہ سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ نہا دھو کر کپڑے بدل کر آئی تھی۔ بال بھی ٹھیک طرح سنوار رکھے تھے۔ پاؤں میں جوتی بھی تھی۔ خاصی تازہ دم نظر آ رہی تھی...... ''وہ...... دراصل...... بسیرے کے زیادہ ہی پڑ گئی ہیں۔''

''زیادہ؟'' میں نے جل کر کہا۔ ''تم نے اس کی جان نکال دی ہوگی۔''

''نہیں!'' وہ احتجاجاً بولی۔ ''جان تو نہیں نکلی۔''

''یہ دیکھا؟'' میں نے اپنا گال اس کے آگے کر دیا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' وہ بولی ''کنّے ماریا؟''

''کنّے ماریا؟''...... میں نے اس کی نقل اتاری۔

''میں؟'' وہ سچ مچ حیران تھی۔

''نہیں بسیرے نے۔''

وہ نظریں جھکائے خاموش تھی۔ پھر بولی۔ ''باؤ جی! تُسی پڑھے لکھے جے' میں دسو کی کراں؟''

''کیا مطلب' کی کراں؟''

''او جی مینوں اصل وچ غصہ بہت آتا ہے۔''

''یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں۔''

''تسی نئیں سمجھ سکدے۔'' وہ بولی۔ ''کوئی بھی نئیں سمجھ سکدا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اب وہ تھکی تھکی سی اور نڈھال سی

ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید اپنے مجازی خدا سے اس حسنِ سلوک کے بعد پشیمان ہو رہی ہے مگر پھر سوچا کبھی پہاڑ بھی پشیمان ہوا کرتے ہیں۔ میں نے کہا ''ننکچر تو میرے پاس نہیں ہے۔البتہ یہ ویزلین لے جاؤ' شاید اس سے کام بن جائے۔''

''اچھا جی!''

میں نے اسے ویزلین کی شیشی تھماتے ہوئے کہا۔''مگر یہ ہڈیوں تک تو اثر نہ کرے گی۔''

اس نے مجھے تڑپ کر دیکھا' عجیب نظریں تھیں اس کی' غصہ' نفرت' کراہت یا بے بسی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کیا کچھ تھا ان نظروں میں۔ اس نے بولنے کو منہ کھولا مگر ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اس نے ویزلین کی شیشی میری طرف اچھال دی۔''رین دیو جی' میں ہلدی چونا لگا دیاں گی۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک طویل سانس لی۔ یہ ہڈی والی بات اسے لگی بہت بری تھی۔ اگر وہ غصے میں میرے بھی دو ہاتھ جھاڑ دیتی تو؟.....مگر پھر سوچا میں بسیرا نہ تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اس کا خاوند نہ تھا۔ غیر مردوں کے ساتھ بیویاں پیار کیا کرتی ہیں ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتیں۔

اس شام میں گیلری میں دیکا صغراں کے ساتھ اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ صغراں کا میاں ریڑھی پر سبزی بیچتا تھا اور خاصا ہٹا کٹا تھا۔ سارا دن ریڑھی لیے گلی گلی گھومتا اور شام کو آ کر نہا دھو' بن سنور کر باہر دودھ والے کی دکان سے آدھ سیر دودھ کا پیالہ پیتا۔ عالمی سیاست پر تبصرہ کرتا اور رات کو جاتا ہوا برفی یا جلیبیاں لے جانی نہ بھولتا۔ صغراں خاصی ٹھسے دار عورت تھی۔ سخت کاٹھی اور بھرے بھرے ہاتھ پاؤں' چلتی تو کمر میں بھنور پڑتے' سفید ململ کی قمیص پہنتی جس میں سے شلوار کا سرخ ازار بند اور پھولدار کپڑے کی انگیا نظر آتی۔ یہ کسی موچی کی سابقہ بیوی تھی اس سبزی والے کے ساتھ بھاگ آئی تھی۔ اس لئے دونوں میں بڑا پیار تھا مگر پیار اور مٹھائی کھلانے کے باوجود جب اسے چڑھتی تو اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کر ڈالتا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ صغراں پر ایک افسانہ لکھوں لیکن اس عورت کی ابھی تک کوئی منطق میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔

میں نے دونوں کی رازدرانہ باتیں سنی تھیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں کسی ایسے افسانے میں کھپا نہ سکتا تھا جو خیر و عافیت کے ساتھ پاکستان میں چھپ سکتا۔

وہ اسے بتا رہی تھی۔ ''تم انداز ہ نہیں کر سکتی ہو کہ اس کی مار میں کیا مزا ہے۔''

''ماروچ کی مزانی جھلیئے۔''

''یہی تو بات ہے۔''

''کانال ماردا اے۔''

''تھپڑ مکے کبھی کبھی جوتیاں۔''

''کمال اے۔''

''وہ جب مارتا ہے تو میں روتی ہوں' چیختی ہوں' اسے گالیاں بھی دیتی ہوں مگر اندر اندر سے مجھے مزا آتا ہے۔''

''کی بکنی ایں۔''

''سچ!'' صغراں جیسے لہک کر بولی۔ ''مارسے جسم درد کرتا ہے' جہاں جہاں وہ مارتا ہے ایک دم جسم جیسے سوسا جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ جسم گرم ہوتا جاتا ہے' جیسے جیسے وہ مارتا جاتا ہے اس گرمی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور پھر جیسے جیسے یہ گرمی بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے ہی مزا بڑھتا جاتا ہے۔''

''حد ہوگئی تیرے والی۔''

''کبھی کبھی جب پندرہ بیس دن گزر جائیں تو میں جان بوجھ کر لڑنے کا بہانہ کرتی ہوں' کبھی کبھی وہ بات ٹال بھی جاتا ہے مگر جب زیادہ تنگ کرتی ہوں تو پھر وہ جوتی اٹھا لیتا ہے۔''

''نی صغراں توں تے پاغل ایں۔''

''نہیں!'' وہ جیسے نشے میں بول رہی تھی۔ ''تم اس بات کو نہیں سمجھ سکو گی۔ ایک مزا تو مار کا اپنا ہے اور دوسرا مزا اس وقت کا جب وہ مجھے مناتا ہے اور جب وہ......'' اس کے بعد صغراں نے آواز بالکل دھیمی کر دی۔ میرا سارا وجود کان بنا تھا۔ میرے کانوں کی آگ پر بیسرے کی جورو کی دبی دبی آوازیں تیل کا کام کرتی رہیں۔

''ہائے میں مرگئی۔''

''نی سچ؟''

''جان دے نی صغراں۔''

''ہائے رب دی سوں توں تے بڑی بے شرم ایں۔''

کچھ دیر کے لئے نیچے خاموشی چھا گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہوں۔ جیسے ایک تو اپنی جانی پہچانی لذت کو یاد کررہی ہو اور دوسری اس لذت کو جو غالباً اس کے مقدر میں کبھی نہ ہو سکے گی۔

اچانک صغراں کی آواز ابھری۔ ''کدی تیرے بسیرے نے نئی تینوں کٹیا؟''

''ہنھ!'' وہ حقارت سے بولی ''بسیرا؟''

''دراصل تم سے وہ ڈرتا بہت ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''اس چھ من کی لاش سے تو ہر شخص ڈر جائے گا۔''

''تیرا گھر والا بھی۔''

''نہیں۔'' صغراں فخر سے بولی۔ ''وہ مرد آدمی ہے' وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔''

''پر بسیرا کیوں ڈردا اے؟'' وہ جیسے احتجاج کررہی تھی۔ ''میں اوہدی تینوں ہاں' وہ میرا گھر والا ہے' کیوں ڈردا اے میرے کولوں!'' کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئیں۔ پھر وہ بولی۔ ''مینوں بسیرا چنگا لگدا اے' سادا جیہا' چھوٹا جیہا' بلی دے بلونگڑے ورگا۔ میں اوندے نال کھیڈ کرنی چاہندی ہاں' پر خبرے اوہنوں کی ہو جاندا اے' پانی جیہا بن جاندا اے۔''

پھر وہ خاموش ہو گئی' صغراں بھی چپ تھی۔ اوپر میں دم سادھے بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔ ''بڑا ای ڈرپوک اے۔ ایسے واسطے مینوں غصہ آندا اے' او دوسرے مرداں وانگ لڑاکا کیوں نئیں' کیوں بزدل اے تے کیوں ڈردا اے۔ تے میرے کولوں کیوں ڈردا اے' اپنی تینویں کولوں؟'' اس نے جیسے سوال کیا مگر جواب نہ پا کر خود ہی بولی۔ ''میں چاہندی آں' او میری دیوار ہووے' میری دیوار..... میں اوہدے

سایے وچ اٹھاں بیٹھاں' میں ایس دیوار وچ سوں جاواں۔'' وہ جیسے بے دم سی ہوگئی' پھر بولی۔ ''صغراں! تیریاں گلاں سن سن کر میرا وی جی چاہندا اے کہ او مینوں کٹے' اوہ میری ہڈیاں توڑ دیوے' میرے گوشت تے نیل پا دیوے' او کٹ کٹ کے مینوں مار دیوے' فیر مینوں اپنے پیار نال زندہ کرے' تیرے میاں وانگ' نئیں! پر میریاں ایسیاں قسمتاں کتھے..... صغراں! او بسیرا نئیں اے' او بسیرا نئیں اے صغراں!!''

مجھے لگا جیسے وہ رو رہی ہو' پھر سوچا یہ کیسے ہوسکتا ہے' کبھی پہاڑ بھی روئے ہیں۔

O.....O.....O

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بیوی کا الاؤ

اصولاً تو ان دونوں کو دوست نہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ ایسی دوستی تھی جو دوستی کے فروغ کے عام فارمولے سے ہٹ کر استثنائی حیثیت رکھتی تھی۔ لطیف ایک معروف ڈاکٹر تھا جب کہ ناظم ایک کیمسٹ۔ کوئی بہت بڑا اور دوا ساز کیمسٹ نہیں بلکہ عام سا کیمسٹ جس کی ساری دکان کا اسٹاک شاید ڈاکٹر لطیف کی ایک ہفتہ کی کمائی سے زیادہ نہ ہو۔ وہ ایک عام سے محلّہ میں عام سے کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ جب کہ ڈاکٹر لطیف کی شہر کے فیشن ایبل علاقے میں ایک کوٹھی زیرِ تعمیر تھی۔ یہ فرق یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے کہ نیگٹو اور پازیٹو ہو سکتے ہیں مثلاً ڈاکٹر لطیف طبیعت کا سنجیدہ اور قدرے لئے دیئے رہنے والا تھا مدتوں کے بعد کہیں جا کر کھلنے والے لوگوں میں سے تھا اور بہت کم لوگوں سے بے تکلف تھا اس کے برعکس ناظم کا یہ حال تھا کہ راہ چلتوں کو پکڑ کر لطیفے سنانے شروع کر دے' قہقہہ سے بات شروع ہوتی اور قہقہہ پر ختم ہوتی۔ اس کے پاس تازہ بہ تازہ لطیفوں کا ایک نا ختم ہونے والا اسٹاک تھا جس سے وہ موقع محل کے مطابق کام لیتا رہتا تھا' اس کے ساتھ بڑی خوبی یہ تھی کہ لچر بات نہ کرتا اور ہنسی مذاق کے باوجود حفظِ مراتب ملحوظ رکھتا۔ طبیعتوں کے یہ تضادات صورتوں میں بھی تھے۔ ناظم چیچک رو اور سیاہ فام تھا۔ سیاہ فام کہہ کر شاید اس کے رنگ کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے کیونکہ اس کا رنگ محض سیاہ نہ تھا بلکہ چمکیلا سیاہ تھا گویا ابھی ابھی اس پر پالش کی گئی ہو۔ اس رنگ کے ساتھ میچ کرتی سفید مسکراہٹ۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہنے کی وجہ سے اس کے سفید دانت لشکارا مارتے

رہتے' بس سارے جسم میں یہی ایک سفید چیز تھی! اس کا جسم گٹھا ہوا اور ورزشی تھا۔ کھلا سینہ بھرے بھرے بازو اور موٹے موٹے ڈنڈ' جسم کے لحاظ سے تو وہ بلاشبہ شربت فولاد کا اشتہار نظر آتا تھا۔ ڈاکٹر لطیف کو فطرت نے مردانہ وجاہت دینے میں بخل سے کام نہ لیا تھا اتنی وجاہت تھی کہ مریض لڑکیاں اپنے اپنے مرض بھول کر اس کے مرض میں مبتلا ہو جاتیں' لمبا قد' گورا رنگ' بھرا بھرا جسم اور ترشے ہوئے لب' ہر رنگ کے لباس میں ہیرو لگتا۔ وہ ایسے پیشے میں تھا کہ جہاں سے چاہتا عورتیں ٹٹول سکتا تھا لیکن اپنی پریکٹس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی بے داغ جوانی پر بھی ناز تھا اور اسی سے دونوں کی فطرت کا ایک اور تضاد نمایاں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر لطیف جتنا شریف اور عورتوں کے معاملہ میں جتنا جھینپو تھا' ناظم اتنا ہی بیباک اور تیز تھا' تیز کیا وہ تو پورا بلیڈ تھا دونوں طرف سے کاٹتا' بھکارنوں' گھروں کی نوکرانیوں اور جمعدارنیوں کا وہ ایکسپرٹ تھا۔ ایکسپرٹ کیا اچھا خاصہ 007 تھا۔ جب کہیں اِدھر اُدھر ہاتھ نہ پڑتا اور زیادہ تنگ ہوتا تو بازار چلا جاتا جہاں گندے لطیفے اور جنسی قصوں سے اس نے بازار کی آدھی عورتوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا تھا جس کے نتیجے میں وہ ہنستے ہنستے روپیہ اٹھنی مار ہی لیتا۔

دونوں کنوارے تھے..... صرف یہی ایک بات مشترک تھی!

دونوں ایک گلی میں کھیلے تھے اور ایک اسکول میں پڑھے تھے' تقسیم ملک کے بعد جب دونوں ایک طویل عرصہ بعد ملے تو ایک ڈاکٹر بن چکا تھا اور دوسرا کیمسٹ' یوں بچپن کی یاد میں دونوں کی دوستی نئے سرے سے استوار ہوئی۔ دونوں کی دکانیں تقریباً ساتھ ساتھ تھیں (بلکہ ناظم نے یہ دکان اسے دلوائی تھی) اس لئے گیارہ کے بعد جب مریضوں کا رش کم ہو جاتا تو ناظم اس کے پاس آ جاتا اور زمانے بھر کے قصہ کہانیاں اور لطیفے ہوتے رہتے۔

ایک دن ناظم بہت خوش آیا' پوچھا تو بولا ''ماں نے شادی کی بات پکی کر لی ہے۔ ایک کشمیری خاندان ہے' ہمارے جیسے ہی غریب لوگ ہیں مگر شریف ہیں۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا'' ڈاکٹر بولا۔ ''تمہیں بھی کوئی لگام دینے والی مل جائے گی۔''

وہ ہنس کر بولا ''میں بھی اِدھر اُدھر چرتے چگتے تنگ آ چکا ہوں اب ٹک کر گھر بسانا چاہیے۔''

اس کے بعد سے دونوں میں شادی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی کیونکہ ناظم اتنا خوش تھا کہ اب وہ اور کسی موضوع پر بات چیت کے قابل نہ رہا تھا۔ ایک دن بولا ''ماں کہہ رہی تھی کہ لڑکی بہت خوبصورت ہے''

''ساسوں کو شادی سے پہلے ہر لڑکی خوبصورت ہی نظر آتی ہے۔''

''نہیں جی یہ بات نہیں۔ وہ تو کہتے ہیں بہت ہی خوبصورت ہے۔''

''اچھا؟''

''اتنی خوبصورت جیسے جھوٹ!''

''ابھی تو شادی نہیں ہوئی اور تم اس سے پہلے ہی شاعر بن گئے۔''

وہ بے شرمی سے ہنس کر بولا ''میں تو اس کے تصور سے ہی فلمی گانے گانے لگتا ہوں۔''

شادی کے دن ہر شریف مرد خوش ہوتا ہے لیکن ناظم جیسی خوشی بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی تھی۔ شادی کے موقع پر عام طور پر دولہا کے دوست ذومعنی فقرات اور چبھتے اشارات سے مذاق کرتے ہیں لیکن یہ ایسا انوکھا دولہا تھا کہ اس کا بس نہ چلتا ورنہ دلہن کے باپ کو بھی ایک دو لطیفے سنا ڈالتا۔ دوست تو ڈر رہے تھے کہ کہیں زیادہ جوش میں آ کر نکاح کے چھوہارے خود ہی لوٹنے نہ شروع کر دے۔

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد' لوگ تو یہ مذاق میں کہتے ہیں لیکن اگر کسی شخص میں شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کا فرق دیکھنا ہو تو ناظم سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہ مل سکتی تھی۔ چند دنوں میں ہوا نکلا غبارہ بن چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا گویا کندھے کسی بوجھ تلے دبے ہیں اور گردن ٹوٹ چکی ہے۔ چہرہ پر زردی اور آنکھوں میں عجب خوف اور دہشت کا عالم۔ نہ وہ باتوں کی پھلجھڑیاں' نہ قہقہوں کی پھوار' دوسروں کا ریکارڈ لگانے والا خود ٹوٹا ریکارڈ بنا بیٹھا تھا۔

اب وہ خالی اوقات میں کلینک پر بھی نہ آتا کئی کئی مرتبہ بلوانے پر آتا اور جب آتا تو آ کر گم سم بیٹھا رہتا۔ کوئی بات کی تو ہوں ہاں کر دی۔ ڈاکٹر نے بہت کریدا مگر اس نے کچھ نہ اگلا۔

ایک رات جب وہ کلینک بند کرنے کو تھا تو ناظم آ گیا۔ وہ یوں رات کو کبھی نہ آیا تھا ڈاکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں' سب ٹھیک ہے۔''

''پھر یہ بے وقت کیسے آ ٹپکے۔'' وہ جواب میں خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر نے ہنس کر کہا۔ ''یہ وقت تو گھر جانے کا ہے نو بجنے کو ہیں۔'' وہ پھر بھی چپ رہا تو ڈاکٹر نے ٹھوکا دے کر کہا ''نئی شادی والے تو.....''

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا تھا کہ ناظم کے منہ سے سسکی نکل گئی اور دوسرے لمحے وہ رو رہا تھا۔ کالے گالوں پر آنسو گویا ابل ابل کر گر رہے تھے۔ ڈاکٹر حیرت سے اسے دیکھتا رہا لیکن اسے ٹوکا نہیں' کچھ دیر بعد وہ خود ہی آہستہ آہستہ چپ ہوتا گیا۔ قمیص کے دامن سے آنسو پونچھے اور بنا پوچھے وہ خود ہی بولا۔ ''وہ تیسرے دن بعد اپنے گھر گئی تھی اور آج دسواں دن ہے اس نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔''

''اس نے انکار کر دیا ہے' مگر کیوں؟''

ناظم نے سر جھکا لیا۔ اس کے جھکے ہوئے کندھے ہل رہے تھے' شاید وہ دوبارہ رو رہا تھا مگر نہیں تھوڑی دیر بعد اس نے منہ اونچا کیا تو آنکھیں ویران تھیں۔ دونوں دوستوں کی نظریں ملیں اور ناظم نے آنکھیں جھکا لیں۔

''تو کیا یہ وہی وجہ ہے جو میں سمجھ رہا ہوں'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

ناظم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''مگر کیسے؟'' وہ حیرت سے بولا ''یہ کیسے؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔''

''تم.....تم تو اتنے تجربہ کار تھے۔''

''میں خود حیران ہوں۔ بس فیل ہو گیا جی میں۔ فیل ہو گیا!''

ڈاکٹر نے باہر جا کر ڈسپنسری سے کمپونڈر کو فارغ کیا اور کلینک کا دروازہ بند کر کے اس کے پاس آ بیٹھا ''مجھے سب تفصیل سے بتاؤ'' اس کا لہجہ ایک ڈاکٹر کا تھا۔

''کیا بتاؤں۔ جی..... بتانے کو کیا رہا ہے۔''

''دیکھو ناظم۔دوست سمجھ کر نہ سہی ڈاکٹر سمجھ کر بات کرو۔''

''خدا قسم کچھ سمجھ میں نہیں آ تا۔''

''ناظم! تم جانتے ہو کہ اگر کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ٹھیک ہے نا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔''

''یہ بات نہیں۔اعتماد نہ ہوتا تو میں یہاں کیوں آ تا۔''

''تو پھر سب کچھ سچ بتا دو۔''

''میں تو خود ہی سب کچھ بتانا چاہتا ہوں مگر بات کا سرا نہیں ملتا۔سمجھ نہیں آتی کہ بات کہاں سے شروع کروں۔''

ڈاکٹر لطیف نے اس سے کرید کرید کر جو کچھ اگلوایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ اس کی بیوی واقعی خوبصورت تھی' بے حد خوبصورت' پہلی رات وہ اس کے حسن سے اتنا مرعوب ہوا کہ دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔آج تک اسے کبھی اپنی بدصورتی کا احساس نہ ہوا تھا مگر پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ تو اس کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے آج تک کنجریوں' فقیرنیوں اور مزدور عورتوں کے ساتھ اس نے خود کو ان سے بلند اور برتر سمجھا تھا کیونکہ وہ اس سے پیسے لیتی تھیں مگر اب یہ اس کی بیوی ہے۔اس کی برفی ایسی سفیدی اس کی سیاہ پالش کا جیسے منہ چڑا رہی تھی' اس سے بھی بڑھ کر یہ احساس تھا کہ دو ٹکے کی عورت سے دو ٹکے کے عوض وہ جو گندہ کام کرتا رہا وہ اس خوبصورت اور شریف بیوی کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ گندگی کا یہ احساس اس کے اعصاب پر یوں حاوی ہوا کہ محسوس ہوتا ہاتھ لگانے سے اس کے بے داغ جسم سے گندگی جیسے چپک کر رہ جائے گی۔وہ خود کو نجاست سے یوں آلودہ محسوس کر رہا تھا گویا اس کے چھوتے ہی وہ ناپاک ہو جائے گی۔گندگی اور ناپاکی کا یہ احساس اس پر بھوت بن کر یوں مسلط ہوا کہ تین راتیں اسی کشمکش میں گزار دیں اور اب اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔

ڈاکٹر نے اسے سمجھایا کہ یہ بے معنی اور غلط سوچ ہے۔خاصی مغز ماری کے بعد

کہیں اس کے چہرے پر رونق آئی تو ڈاکٹر نے کہا ''میں تمہیں ایک انجکشن لگاتا ہوں اور کچھ گولیاں دیتا ہوں' یہ کھاؤ۔''

''مگر؟''

''اگر مگر کچھ نہیں۔''

انجکشن لگتے ہی چہرہ پر تازگی کی ایک لہر دوڑ گئی اس کے بعد ڈاکٹر بولا۔'' چلو میں تمہارے سسر سے بات کرتا ہوں۔''

وہ خوف زدہ ہو گیا'' پتہ نہیں اس نے کیا کچھ کہہ رکھا ہے۔''

''کہنے دو...... ڈاکٹر جو ساتھ چل رہا ہے۔''

آدھی رات تک اس کے سسر اور ساس سے بک بک جھک جھک ہوتی رہی تب کہیں جا کر انہوں نے ڈاکٹر کی شہادت تسلیم کی چنانچہ اسی وقت انہوں نے بیوی اس کے ساتھ کر دی۔

ڈاکٹر تمام رات ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ صبح کلینک آنے سے پہلے اس کی دکان پر گیا مگر دکان بند تھی اس نے خوش ہو کر سوچا رات بھر کا جاگا سو رہا ہو گا مگر سارا دن دکان بند رہی اور اگلے دن بھی۔

رات کو کلینک بند کرنے تک وہ خود ہی آ گیا اور اس کے چہرہ پر ایک نگاہ ڈالتے ہی وہ سب سمجھ گیا'' بات نہیں بنی' ' وہ جیسے رُندھی آواز میں بولا۔

''کیا ہوا۔''

''کچھ بھی نہیں۔''

''مگر کیوں یہ انجکشن تو مردہ کو بھی ایک مرتبہ زندہ کر دے۔''

''مردہ کو زندہ کر سکتا ہو گا مگر میں تو زندہ ہوں۔''

''پھر بھی کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''کیا بتاؤں جی۔ اس کی خوبصورتی خوفزدہ کر دیتی ہے۔''

''تم بھی عجب انسان ہو۔ لوگ خوبصورتی پر جان دیتے ہیں اور تم ہو کہ خوبصورتی سے خون خشک ہوتا ہے۔''

''میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے سفید رنگ بھولے بھالے اور معصوم چہرہ کو دیکھتے ہی بس دماغ میں یہ خیال آجاتا ہے کہ یہ اتنی صاف پاک اور شریف عورت ہے اور میں اسے کیسے ناپاک کردوں۔ اپنی بیوی کو کیسے گندہ کردوں''
وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ پیتا رہا پھر بولا۔ ''ویسے میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

ڈاکٹر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو بولا ''میں نے بازار جا کر خود کو ٹیسٹ کر لیا ہے آپ کا انجکشن واقعی لاجواب ہے۔'' اس بات پر وہ اس کا منہ تکتا رہ گیا پھر پوچھا ''کل دکان کیوں نہ کھولی۔''

''مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں پھر نہ چلی جائے۔''

''اور اب؟''

''باہر سے تالہ لگا کر آیا ہوں۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا تھا۔ ''ساس اور بہو دونوں کو بند کر دیا ہے۔''

''ناظم! تم حماقت کر رہے ہو۔''

''کیوں؟''

''بھلا عورتوں کو تالوں میں بند رکھنے سے کہیں ایسے مسئلے حل ہوتے ہیں۔''

''جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔''

''تو پھر؟''

''مگر میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ اس کا حسن' یقین مانئے جی گھر میں بتی کی ضرورت نہ پڑے۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر جیسے اپنے آپ سے بولا' ''عجب شادی ہے ہماری بھی'' اس نے خاموشی سے سگریٹ کے ایک دو گہرے کش لئے پھر بولا ''کمال ہے میں اس کے حسن پر جان بھی دیتا ہوں لیکن اس سے خوفزدہ بھی ہوں۔ ہے نا عجیب' شاید میں پاگل ہو رہا ہوں۔'' وہ یوں بول رہا تھا گویا اکیلا ہے پھر اس نے سرگوشی میں کہا۔

''وہ بے چاری کیا سوچتی ہو گی میرے بارے میں۔''

''وہ اپنے بارے میں بھی تو سوچ سکتی ہے۔''

اس نے یوں چونک کر دیکھا گویا ڈاکٹر کے وجود سے اب تک بے خبر تھا اور اب پہلی مرتبہ اسے دیکھ رہا ہو۔ "اپنے بارے میں؟ ٹھیک کہا آپ نے اپنے بارے میں بھی تو سوچ سکتی ہے۔"

اس کے بعد وہ گم سم سا چلا گیا۔

اگلے دن بھی اس کی دکان بند رہی رات کو وہ آیا۔

"اس کی طبیعت خراب ہے ذرا گھر چل کر اسے دیکھ لیں۔"

"تو گویا وہ ابھی تک گھر میں ہے۔"

"جی ہاں!"

"اور تالہ لگا کر آئے ہو؟"

"آج تو اور بھی ضروری تھا کہ ماں شادی پر دوسرے محلے میں گئی ہے اکیلی تو میں بالکل نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اگر کوئی خاص بات نہیں تو مجھے بتادو میں دوا دے دیتا ہوں۔"

"نہیں، وہ کوئی زنانہ بیماری ہے مجھے اس نے نہیں بتایا۔"

"ابھی سے اسے کہاں سے زنانہ بیماری ہوگئی۔"

"کیوں وہ عورت نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں۔"

"جی زنانہ بیماری کا کیا ہے کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔"

"ویسے کہتی کیا ہے۔"

"کہتی ہے درد ہے۔"

اس نے میڈیکل بکس اٹھا لیا اور دونوں چل پڑے۔ واقعی اس نے تالہ لگا رکھا تھا۔ اس نے دھڑ سے دروازہ کھولا سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا تھا صرف ایک کمرہ میں روشنی تھی وہ اس میں لے گیا۔ اس کی بیوی ایک دم گھبرا کر کھڑی ہوگئی وہ بولا تو جیسے ہکلا رہا ہو۔ "یہ ...... یہ ...... یہ ہیں۔ میرے جگری دوست اور مہربان ڈاکٹر لطیف" ڈاکٹر گویا سحر زدہ اسے دیکھے جا رہا تھا، اس نے سوچا واقعی اس کی موجودگی میں کمرہ میں بتی کی ضرورت نہیں۔

ناظم کہہ رہا تھا۔ ''بڑی مشکل سے لایا ہوں انہیں۔ اب سب کچھ بتا دو انہیں۔''

وہ اسی طرح خاموش کھڑی رہی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے چارپائی پر لٹا دیا یہ ''دیکھیں۔ یہ دیکھیں۔'' وہ اس کی قمیص اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''یہاں درد ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا کہ کسی کنویں کی گہرائی سے جیسے ناظم کی آواز ابھری ''آپ اطمینان سے اسے دیکھیں میں آپ کے لئے کوکا کولا لے آتا ہوں۔''

O.....O.....O

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بیویوں کی سازش

''سچ؟'' وہ حیران بھی تھا اور خوش بھی۔
''کیوں نہیں؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں آنکھ ٹیڑھی کر کے اسے دیکھ رہی تھی۔
''مجھے یقین نہیں آتا۔''
''بھئی! اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔''
''پھر بھی......''
وہ پھر گردن ٹیڑھی کر کے اسے اپنے مخصوص انداز میں دیکھتی ہے اور مسکراتی ہے' ادا سے گردن کو جنبش دیتی ہے اور پھر مسکراتی ہے۔
''کیا کہتی تھیں؟''
وہ ہنستی ہے۔ ''بھئی ہو بڑے خود پرست۔''
''کیوں؟''
''بار بار تعریف سنتے ہو اور جی نہیں بھرتا۔''
''نہیں نہیں'' وہ احتجاج کرتا ہے۔
''میں سب سمجھتی ہوں تمہاری چالاکیاں۔'' وہ پھر اسی طرح ترچھی نظروں سے دیکھتی ہے یوں دیکھنے سے اس کے حلق کے نیچے ایک گڑھا پڑ جاتا ہے جو بہت اچھا لگتا ہے۔ ''شمسی کہتی تھی تم بہت اسمارٹ ہو۔''
وہ کھل اٹھتا ہے مگر بظاہر سنجیدہ لاپرواہی کا اظہار کرتے ہوئے مزید تعریف کے

لئے اکسانے کو کہتا ہے۔ ''مجھ میں تو کوئی ایسی بات نہیں یہ اس نے کیسے کہہ دیا۔''

''اب یہ تو میں جانتی نہیں کہ کوئی بات ہے یا نہیں لیکن شمسی تم سے بے بہت امپریس۔''

''کمال ہے۔''

''وہ کہتی تھی تم ایک آئیڈیل خاوند ہو۔''

اس پر وہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔ یہ آئیڈیل خاوند والی بات مشکوک بلکہ خاصی خطرناک تھی۔ ہر بیوی کے نزدیک آئیڈیل اور خاوند کا جداگانہ بلکہ ذاتی قسم کا مفہوم ہوتا ہے اور یوں اس لفظ میں نفرت' حقارت مذمت' پچکار' دلار' تعریف اور رشک وحسد بہت سے معانی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ بیویوں کی لغت کے ایسے خفیہ الفاظ ہیں جن کے درست معنی سمجھنے کے لئے بات کہنے والی کے چہرہ کو دیکھنا بلکہ پڑھنا ہوتا ہے۔ آئیڈیل خاوند وہ کس لہجہ میں کہتی ہے' بھوں کمان بن کر کتنی کھنچتی ہے اور مسکراہٹ کا کیا انداز ہے' اس نے غور سے بیوی کا چہرہ دیکھا مگر وہ سلیس تھا۔ چنانچہ اپنے آئیڈیل خاوند والی بات کو بطور تعریف قبول کرتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''مگر تم بھی آئیڈیل خاوند تسلیم کرتی ہو یا نہیں۔''

وہ ہنس کر کہتی ہے ''میری بات اور ہے۔''

اور وہ مصرع مکمل کر دیتا ہے ''میں نے تو محبت کی ہے۔'' پھر رک کر بولا ''اچھا! تم نے اپنی عادت کے عین مطابق اس بات کی تردید تو کی ہو گی کہ میں آئیڈیل خاوند نہیں ہوں۔''

''نہ بابا! میں کیوں تردید کرتی۔ میں تو ہمیشہ تمہاری تعریف سے خوش ہوتی ہوں۔''

''اچھا؟'' وہ تمسخرانہ لہجہ میں بولا۔

''سچی مچی!''

''اچھا! تو اور بھی تعریف کی تھی۔''

''ہاں ہاں! کیوں نہیں' کہتی تھی۔ کہتی تھی......'' وہ ہنس کر خاموش ہو جاتی ہے۔

’’کیا کہتی تھی۔‘‘

’’نہیں بھئی میں نہیں بتاتی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’بس!‘‘

’’بتادو ورنہ میں گدگدی کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ اس کی پسلیوں کی طرف بڑھائے۔ وہ چیخ کر بولی ’’مت کرنا۔‘‘

’’بتاؤ پھر۔‘‘

’’اچھا بابا! تم تو ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو‘‘ وہ سرخ سرخ ہو کر بولی‘ کہتی تھی تم بہت اچھے لور ہو گے۔‘‘

’’ہائیں!‘‘ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ یہ کم بخت بیویاں کتنی فحش کلام ہوتی ہیں۔

’’اچھا؟‘‘ مگر وہ ابھی تک سنبھلا نہ تھا ’’اچھا!‘‘ اس نے کہا۔ ’’اور تم نے حسب عادت تردید نہ کی۔‘‘

’’ہیں.....‘‘ وہ پھر سرخ ہو رہی تھی۔

’’کیا کہتی ہو تم بیچ اس مسئلہ کے۔‘‘

’’مجھے نہیں پتہ۔‘‘ وہ چڑ کر بولی۔

’’تو پھر کسے پتہ ہو گا۔‘‘ وہ اس کے قریب سرک گیا‘ گفتگو کے اس رخ سے وہ بہت مزا لے رہا تھا۔

’’چلو ہٹو یہاں سے! آ گئے اپنی گندی باتوں پر‘‘ وہ مصنوعی غصہ سے اسے پرے دھکیلتی ہے۔

وہ چار سہیلیاں ہیں۔ ایک اس کی بیوی اور باقی بھی اپنے اپنے طور پر بیویاں ہیں۔ کالج میں اکٹھی پڑھتی تھیں‘ پھر شادیاں ہو گئیں تو جہاں بھی رہیں خط و کتابت سے رابطہ رکھا اور اب اتفاق سے وہ چاروں ایک شہر میں جمع ہو گئی تھیں۔ آپس میں ان کا پیار دیکھ کر ایک جان چار قالب کی ضرب المثل وضع کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اول تو روز ملتیں‘ اگر ایسا نہ ہو سکتا تو گھنٹوں فون پر نہ ملنے کا ایریئر کلیئر کیا جاتا۔ ویسے اسے بیوی کی سہیلیوں سے کبھی

زیادہ دلچسپی نہ رہی تھی کیونکہ سالی کی طرح یہ بھی بڑا بے تکا سا رشتہ ہے' بنی ہو تو آدھی گھر والی نہ بنے تو تو کون میں کون' ویسے بھی اس کی اپنی باہر کی زندگی کافی سے زیادہ دلچسپ تھی اس لئے اس نے سہیلیوں یا ان کے خاوندوں میں بطور خاص کوئی دلچسپی لینے کی ضرورت نہ محسوس کی' عام بیویوں کی مانند اس کی بیوی بھی باتوں کی شوقین بلکہ فن کار تھی چنانچہ اس سے وہ اپنی سہیلیوں کی ہر طرح کی باتیں کرتی اور بڑی باقاعدگی سے کہ اس کی دانست میں یہ بھی وظیفہ زوجیت میں شامل تھا۔ چنانچہ وہ ان سہیلیوں ان کے خاوندوں اور ان کے رشتہ داروں کے بارے میں باتیں کرتی رہتی۔ عام زندگی کی ایسی باتیں کرتی جن میں وہ اپنی مخصوص حسِ مزاح سے لطف پیدا کر دیتی اس کے صلہ میں وہ اس سے بیرون خانہ دلچسپیوں کی ڈائری سننے کی توقع رکھتی تھی چنانچہ جواب آں غزل کے طور پر دہ بھی ایڈیٹنگ کے بعد اسے باہر کی باتیں سنا دیتا مگر اصل مزا تو بیوی کی باتوں میں تھا چنانچہ باتیں سن سن کر وہ ان سہیلیوں کے مزاج اور عادات اور ان کے خاوندوں کی مخصوص حرکات تک کے بارے میں جان چکا تھا حتیٰ کہ ان امور کے بارے میں بھی! مثلاً اسے معلوم تھا کہ مسز توقیر کے میاں پہلے خوب سر کی مالش کراتے ہیں' ثمینہ کا خاوند بعد میں ایک سیکنڈ کے اندر سو جاتا ہے' فخر النساء نے اپنے میاں کا کتنا راتب باندھ رکھا ہے اور شمسی کی عین اس وقت بولنے کی عادت!

توبہ! یہ بیویاں بھی کتنی پورنوگرافک ہوتی ہیں!

اور پھر اس کے ذہن میں شک کا کانٹا چبھا۔ کیا میری بیوی بھی؟

نہیں! نہیں!! وہ بھلا ایسی کیوں ہونے لگی' وہ تو بہت سیدھی اور بے حد بھولی ہے۔ وہ ان کٹنی سہیلیوں جیسی نہیں ہو سکتی' بلکہ اگر اس نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات کی بھی تو وہ لال لال ہو جاتی۔ اور پھر اس کی صورت ایسی تھی کہ عورت ہو کر بھی اس سے لڑکپن نہ گیا تھا۔ گول مٹول چہرہ پھولے پھولے گال' گڑیا جیسی بڑی بڑی آنکھیں اور چھوٹی سی ناک وہ سچ مچ گڑیا لگتی تھی بلکہ شادی کے ابتدائی ایام میں تو وہ اسے گڑیا ہی کہتا تھا اور اس کے ساتھ ویسے ہی کھیلتا تھا جیسے گڑیا کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔

اس نے سوچا ویسے شکلوں کا کیا ہے یہ بازی گر دھوکہ بھی تو کھلا دیتی ہیں۔ اب اس کی سب سے چہیتی سہیلی شمسی بلا کی سنجیدہ اور مدبر عورت تھی' انداز میں وقار اور حرکات

میں تمکنت' اور اگر اس کی بیوی نے یہ سب کچھ نہ بتایا ہوتا تو اس کے چہرہ مہرہ سے اس کے سیکس کریزی ہونے کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا' اور اس نے سوچا اپنی گڑیا کو بھی اس سے بچانا چاہیے کہیں وہ بھی اسے سیکسی یا کریزی نہ بنا ڈالے اور اسے یقین تھا کہ یہ لور والی بات اسی نے کہی ہوگی۔

''میرا خیال ہے یہ شمسی نے کہا ہوگا۔''

''کیا کہا ہوگا؟''

''وہ لور والی بات۔''

وہ اسے اپنے مخصوص انداز میں گردن ٹیڑھی کر کے دیکھتی ہے' بڑی بڑی آنکھوں کو گھماتی ہے اور ناک سکیڑتی ہے۔''اللہ رے خود پرست میاں۔''

''کیوں؟''

''ابھی تک اس ایک معمولی سی بات سے چسکا لئے جا رہے ہو۔''

''نہیں! نہیں تو۔''

''پھر یہ شمسی کا نام کیوں لیا؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ ایسی باتوں میں شمسی ہی دلچسپی لیا کرتی ہے۔''

وہ بھوں کی کمان سوالیہ انداز میں کھینچتی ہے۔''صرف شمسی کیوں؟''

"You too Brutus"

وہ ہنس کر کہتی ہے۔''بہر حال یہ شمسی نہیں ہے۔''

''تو پھر کون؟''

''بوجھ لو۔''

''اس میں بوجھنے کی کیا بات ہے وہ نہیں تو باقی تین میں سے تو کوئی نہ کوئی یقیناً ہو گی۔''

''تین ہی کیوں' وہ عجیب سے لہجے میں جواب دیتی ہے۔

''بھئی! سسپنس کیوں پیدا کر رہی ہو۔''

''آپ کو تو بے کار باتوں کے لئے وقت چاہیے مجھے تو نیند آ رہی ہے۔'' وہ

کروٹ بدل لیتی ہے۔ شادی کے تین سال گزارنے کے بعد اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ کروٹ مدعو کرنے والی نہیں ہے۔

یہ بات بظاہر معمولی سی تھی اور میاں بیوی کم از کم پیار محبت کرنے والے میاں بیوی میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں مگر نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں تجسس کی کھٹک شروع ہوگئی۔ آخران میں سے کون ہے جو اس میں اس انداز کی دلچسپی لے سکتی ہے؟ یقیناً ایسا ہی ہے ورنہ اسے لوروالی بات کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود پرست سہی لیکن کاسانوا کبھی بھی نہ رہا تھا بلکہ خاوندوں کی اکثریت کے برعکس اپنی بیوی کے ساتھ خوش بھی تھا۔ شاید اسی لئے اس نے اپنی بیوی کی سہیلیوں میں اس انداز سے کبھی بھی دلچسپی نہ لی تھی۔ مگر اس بظاہر غیر اہم بات نے اس میں ہلچل پیدا کردی۔ ایک عورت نے (ہر چند کہ وہ بیوی کی عزیز ترین سہیلی تھی بلکہ اس لحاظ سے تو وہ اور بھی غیر عورت تھی) جس انداز سے اس کی جنسی استعداد کی تعریف کی تھی وہ اپنی جگہ خواہ کتنی ہی قابلِ مذمت کیوں نہ ہو مگر اس کے لئے تو عجب طرح کا محرک ثابت ہوئی تھی۔

وہ سوچتا ہے اور سوچتا ہے۔

"A penny for your thought"

وہ پاس آکر عجب مسخرہ پن سے کہتی ہے وہ ہنس کر اسے دیکھتا ہے۔

''کس سوچ میں گم ہو۔''

''نہیں تو''

''تو پھر کہاں غوطے لگا رہے ہو۔''

''کہیں بھی نہیں۔ میں ذرا تمہاری سہیلیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''او!''

''کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔'' وہ صفائی پیش کرتا ہے۔

''تم ایسی ویسی بات کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔''

''بڑا خراب امپریشن ہے میرا۔''

''میری نگاہ میں تو خیر یہ امپریشن بہت اچھا ہے البتہ میری سہیلیاں......'' وہ جملہ

ادھورا چھوڑ کر شریر آنکھوں سے اسے دیکھتی ہے۔

''ہاں!ہاں۔''

''کچھ نہیں۔''

''کوئی فضول بات ہوگی۔''

''فضول جیسی فضول، مگر چھوڑو اس قصے کو۔''

مگر یہ قصہ آسانی سے چھوڑا نہ جاسکتا تھا۔ وہ کرید کرید کر سہیلیوں کے بارے میں پوچھتا رہتا ہے۔ ان چاروں میں سے ایک کو الگ کرنا چاہتا ہے مگر یہ تو پانی میں سراب تلاش کرنے والی بات ثابت ہوتی ہے۔

وہ خود کو پانی پر دھری کیتلی کی طرح محسوس کرتا ہے۔

جب اس نے کال بیل پر انگلی رکھ کر اسے نہایت ہی آہستگی سے دبایا تو پھر دل میں بیوی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے گفتگو کے دوران یوں ہی سرسری طور پر کہے تھے کہ شمسی کا خاوند چند دن کے لئے باہر گیا ہے۔ خاوند باہر گیا ہے۔ خاوند باہر گیا ہے' خاوند باہر گیا ہے۔ یہ الفاظ اعصاب کے سٹیریوفونک سسٹم پر دو دن تک جسم میں گونجتے رہے تو تیسرے دن نہ رہا گیا۔ جس انگلی سے بیل دبائی تھی اس میں ابھی تک لرزش تھی!

وہ اسے دیکھ کر اگر حیران ہوئی تو اس کا اظہار نہ کیا یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ اظہار کر رہی ہو مگر یہ محسوس نہ کرسکا ہو۔ البتہ اس کی مسکراہٹ کو وہ یقیناً محسوس کررہا تھا۔ عجب سی مسکراہٹ تھی' بے نام کیفیات کی حامل۔

''آیئے! آیئے!!'' استقبال کرنے کا انداز کسی بوطیق کی سیلز گرل جیسا تھا وہ خود شعوری سے کھانسا۔

وہ اس کے آگے آگے عجب انداز سے چل رہی تھی۔ بلاوز کے نیچے گوشت کی سلوٹوں کے ساتھ اس کا سارا جسم لہراتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ ہمارے گھر تو کبھی یوں لہرا کر نہ چلی تھی۔ جب ڈرائنگ روم میں لا کر اسے تشریف رکھنے کو کہا تو ایک لمحہ کو ٹھٹھک کر رہ گیا وہ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ وہ سیدھی بیڈروم میں لے جائے گی۔

''بیٹھیے نا۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''ہاں جی ہاں! جی ہاں!!'' وہ صوفہ کے کنارے پر ٹک گیا' وہ کئی مرتبہ اس ڈرائنگ روم میں آچکا تھا مگر آج اسے یہ کچھ بدلا سا نظر آرہا تھا۔

''چائے لے آؤ۔'' اس نے زور سے آواز دی مگر پھر ہنس دی ''ملازمہ تو ان دنوں اپنے گاؤں گئی ہے۔ یوں ہی عادتاً آواز دے بیٹھی۔'' وہ اس کی طرف دیکھ کر ہنسی ''میں بنالاتی ہوں۔''

وہ اسے کہنا چاہتا ہے کہ وہ چائے پینے نہیں آیا مگر منہ کھولنے سے پیشتر وہ کچن میں جا پہنچی جہاں سے اب اس کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔

''چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلیں!''

مگر نہیں! یہ وہ کیسے گنگنا سکتی ہے یہ تو اس کی پیدائش سے بھی پہلے کا ایک مقبول گیت تھا۔ یہ وہ کیسے گنگنا سکتی ہے اسے تو زیادہ سے زیادہ میں گنگنا سکتا ہوں' یقیناً یہ اور کوئی گیت ہوگا جو میرے کانوں کو کچھ اور سنائی دے رہا ہے۔ اس نے تو یہ گیت کبھی سنا بھی نہ ہوگا مگر وہ گا کیوں رہی ہے؟ تو پھر کیا مجھے گانا چاہیے؟ مگر اس سچویشن میں میں کیسے گا سکتا ہوں وہی گائے جس کا کچن ہے۔

چائے کے ساتھ بہت کچھ کھانے کو تھا۔

''یہ سب؟''

ہنس کر بولی ''نہ جانے کون کب آجائے اس لئے فرج بھرا رکھتی ہوں۔''

''تو آپ کسی اور کی منتظر تھیں۔''

''نہیں تو۔ بلکہ میں تو.....'' وہ ہنس کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔

وہ خاموشی سے کیتلی میں رواج کے عین مطابق ایک چمچ چینی ڈال کر قہوہ ہلا رہی ہے' اس کی آنکھیں جھکی ہیں اور نہایت منہمک نظر آتی ہے۔ وہ اسے پہلی مرتبہ غور سے بلکہ ایک مرد کی آنکھ سے دیکھ رہا ہے' آج تک اس نے اسے صرف بیوی کی محترم سہیلی کے روپ میں دیکھا تھا مگر اب وہ اسے عورت کے طور پر دیکھ رہا تھا اور جو کچھ دیکھ رہا تھا خاصا اچھا لگ رہا تھا۔ بال ایک لہر کی مانند جھکے چہرہ کے ساحل سے ٹکرا رہے تھے۔ ہونٹ بھرے بھرے ہیں اور ان پر بالوں کی کومل دھار' ویسے وہ خوبصورت نہ تھی' وہ سیکسی بھی نہ تھی البتہ گالوں کی

ابھری ہڈیاں اور نوکیلی ٹھوڑی نے اس کے چہرے کو ایک دلچسپ چہرہ بنا دیا تھا۔ اسے نہ تو مونچھوں والی عورتیں اچھی لگتی تھیں اور نہ وہ جن کے ہنسنے میں مسوڑھے نظر آئیں مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس میں سے یہ دونوں خصوصیات منفی کر دینے سے اس کی شخصیت کا تاثر کسی نہ کسی طرح سے کم ہو کر رہ جائے گا۔ اس نے کپ پکڑایا تو اس کی مسکراہٹ میں مسوڑھوں نے گلابی رنگ گھول دیا تھا۔ اسے کپ دے کر صوفے کی پشت پر ٹیک لگا کر وہ ایک لمبی سانس لیتی ہے تو بلاوز کی وکٹری والی وی سے دونوں چھاتیاں اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی ہیں حتیٰ کہ وہ سانس روک لیتا ہے کہ کہیں یہ بالکل باہر ہی نہ ہو جائیں مگر خیریت رہتی ہے کہ عین وقت پر وہ سانس باہر نکال کر انہیں واپس نیچے بھیج دیتی ہے۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

وہ گھبرا کر لمبا گھونٹ بھرتا ہے تو گرم چائے تالو اور حلق جلا دیتی ہے۔

''کیا زیادہ گرم ہے؟''

''ہاں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں ''کچھ زیادہ ہی گرم۔''

''تو پھر ٹھنڈی کر کے پینی چاہیے تھی نا۔''

''ہاں! ٹھنڈی کر کے ہی پینی چاہیے تھی۔'' اور پھر ایک لمحہ کے توقف کے بعد ''بلکہ ٹھنڈی ہی پینی چاہیے تھی۔''

وہ کپ میز پر رکھ دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے ''اچھا میں اب چلتا ہوں۔''

وہ اسی طرح صوفے میں دھنسی اسے عجیب نظروں سے دیکھتی ہے' پھر مسکراتی ہے اور پھر ہنستی ہے۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے سامنے کھڑا وہ خود کو چغد محسوس کر رہا ہے۔

''اسے تو ختم کر لیں۔'' وہ چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وہ نہ اسے دیکھتا ہے اور نہ چائے کے کپ کو 'میں چلتا ہوں'

مگر وہ اسی طرح بیٹھی ہے' خدا حافظ کہنے کو بھی نہیں اٹھتی' وہ دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے ہانک لگائی ''بھائی جان! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیسے تشریف

لائے تھے۔''

وہ قدم اور تیز کر دیتا ہے اور جواب دیئے بغیر تقریباً بھاگتا گھر سے باہر نکل آتا ہے اور تب اسے احساس ہوتا ہے کہ چائے اتنی گرم نہ تھی کہ آنکھوں میں آنسو لے آتی بلکہ اس میں مرچیں بے انتہا ڈال دی گئی تھیں۔ ذلت کے احساس سے آنکھوں میں دوبارہ آنسو آ گئے اور پھر اس نے سوچا ہو سکتا ہے وہ واقعی یہی گنگنا رہی ہو'' چھوٹے سے بلماں مورے آنگنا میں گلی کھیلیں۔''

گھر پہنچا تو موڈ سخت خراب تھا۔ وہ ٹیلی فون بند کر کے آئی تو کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھے اسے عجیب نظروں سے گھورنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ غصہ سے بولا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ یہ منہ کیوں سوجا رکھا ہے۔''

''وہ تمہاری شمسی......''

''کیا ہوا اسے؟''

''سخت بدتمیز عورت ہے۔''

''کیوں؟''

''مجھے چائے میں مرچیں گھول کر پلا دیں۔''

''تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟''

''میں......میں......''

''ہاں! ہاں تم!''

''میں تو وہاں فون کرنے گیا تھا۔''

''فون''

''ہاں! ہاں!'' وہ غصہ سے بولا'' مجھے ایک بہت ضروری فون کرنا تھا اس کا گھر قریب تھا میں نے سوچا فون بھی کرلوں گا اور ذرا سانس بھی لے لوں گا۔''

وہ خاموشی سے اسے گھورتی رہی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''کیوں کیا ہوا؟''

مگر اس کی ہنسی رک نہ رہی تھی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

''میں تصور کر رہی ہوں کہ جب تم نے مرچوں والی چائے کا گھونٹ بھرا ہوگا تو تمہارا کیا حال ہوا ہوگا۔''

''شمسی سے ہی پوچھ لینا۔'' وہ جل کر بولا۔

اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ہنسنے میں کتنی اچھی لگتی ہے۔ نہ اس کے لبوں پر بال ہیں اور نہ ہنسنے میں مسوڑھے نظر آتے ہیں۔ شرمندہ سا ہو کر وہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتا ہے۔

رات کو وہ خود بخود اس کے بستر پر آ جاتی ہے (یہ ایک اعزاز ہے کیونکہ وہ خود کبھی بھی بستر پر نہ آتی تھی) وہ اسے پشت پرسے لپٹ جاتی ہے ''تم بڑے ایڈیٹ ہو مگر ہو ڈارلنگ'' وہ اس کے کانوں میں سرگوشی کرتی ہے اور ساتھ ہی کان کی لو میں دانت مار کر کہتی ہے ''باقی تین شمسی سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہو سکتی تھیں۔''

وہ ایک دم ٹینس ہو جاتا ہے مگر وہ اسے گدگداتی ہے ''ریلیکس ریلیکس ڈارلنگ! تم نے ٹیسٹ پاس کر لیا ہے'' وہ کان کی لو کو لبوں میں لے کر دباتی ہے۔ ''انعام نہ لو گے؟''

اور پھر یوں ہی سرسری انداز میں پوچھا۔ ''تم دورے پر کب باہر جا رہے ہو؟''

O.....O.....O

مٹھائی کی پلیٹ اور دودھ کا گلاس

اسے کوئی احساس نہ تھا کہ رات کتنی بیت چکی ہے۔ وہ خود کو سمندر کی تہہ میں غرق شدہ شکستہ کشتی کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور ذہن جیسے ابھی تک گرداب میں ہو۔ اس کے دونوں ہاتھ سینہ پر تھے جیسے وہ خود کو کسی نادیدہ حملہ آور کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کی خواہاں ہو۔ بال پسینہ میں بھیگے تھے ہونٹ سنگترے کی چوسی ہوئی پھانک محسوس ہو رہے تھے۔ خود کو وہ بری طرح چچوڑی ہوئی ہڈی سے بھی زیادہ بے وقعت سمجھ رہی تھی۔ اسے اپنا جسم ناپاک اور گندگی سے آلودہ جوتی کے تلے جیسا لگ رہا تھا۔

یہ شادی کی پہلی رات تھی۔

اور زرینہ خراٹے لیتے خاوند کے پہلو میں بیدار لیٹی تھی۔

جب سرخ جوڑے میں ملبوس' زیورات سے لدی پھندی اور اُبٹن سے نکھری ہوئی سترہ سالہ زرینہ بوڑھی نائن اور ایک دو معتبر عورتوں کی معیت میں حجلہ عروسی میں لائی گئی تو اس کا دل انجانے خوف سے لرز اٹھا۔ رو رو کر اس کی بری حالت ہو چکی تھی مگر کمرہ میں آتے ہی جیسے اس پر غشی سی طاری ہو گئی۔ کمرے میں بھانت بھانت کی عورتیں جمع تھیں۔ سب کے بیک وقت بولنے اور بچوں کے شور نے اس کے اعصاب پر اور بھی برا اثر کیا۔

کمرہ میں لانے سے پہلے کھانا لایا گیا تھا مگر اس کے حلق سے ایک نوالہ بھی نہ اتر سکا تھا۔ اپنے گھر والوں سے دور ایک اجنبی گھر میں انجان لوگوں میں وہ خود کو بے بس ہرنی محسوس کر رہی تھی۔ اب بھوک بری طرح سے چمک چکی تھی۔ باتیں' شور' بچوں کا

اودھم......وہ چیخ کر سب کو خاموش کرانا چاہتی تھی لیکن نہ کر سکی۔

جب وہ بے ہوش ہو کر گٹھڑی بن کر لڑھک گئی تو سب ایک دم چپ ہو گئیں۔ لیکن صرف ایک ثانیہ کو...... جب چند لمحات بعد اس کی آنکھیں کھلیں تو کسی نے اسے سہارا دے کر اس کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگا رکھا تھا۔ اس کی بے ہوشی پر بھی فقرے چست کیے گئے مگر جلد ہی سب کمرے سے رخصت ہو گئیں۔ اب وہ اور میکے سے آئی ہوئی نائن رہ گئی تھیں۔ نائن اُٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی' وہ اسے عملی قسم کے مشورے دے رہی تھی مگر اس کا ذہن تو جیسے دھند میں ملفوف تھا۔ کچھ باتیں کان میں پڑیں اور جو کان میں پڑیں ان میں سے کچھ اس کے پلے نہ پڑیں۔

کراہت سے اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور شفون کے سرخ دوپٹہ میں سے اسے نائن کے سفید بال' ہنسی سے باہر نکلے ہوئے پیلے دانت نظر آ رہے تھے۔ وہ ایسے محسوس کر رہی تھی گویا اس کے منہ میں مکھی ہو۔ نہ جانے نائن نے یہ مشورے کتنی نئی دلہنوں کو دیئے تھے۔ اس کی ہنسی عیاں کر رہی تھی کہ یہ مشورے دیتے وقت وہ خود بھی چسکا لیتی ہے۔

کسی نے آ کر دولہا کی آمد کی اطلاع دی تو نائن جلدی سے اٹھی۔

وہ دو دنیاؤں کے درمیان معلق' ایک دنیا اس کا گھر تھی وہ اسے چھوڑ آئی تھی۔ دوسری دنیا اس کے خاوند کا گھر ہو گا جس کا دروازہ ابھی وا نہ ہوا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نومبر کی خنکی کے باوجود بھی ماتھے پر پسینہ تھا' جسم میں خفیف سی کپکپی اور تیز سانس سے انگیا میں پھنسی چھاتیاں سکڑ اور پھیل رہی تھیں۔ اس کا سر خود بخود نیچے کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ سرخ دوپٹہ گھونگھٹ کی صورت میں اور بھی نیچے کھسک آیا تھا۔ حلق خشک' ہونٹ دو سوکھی پنکھڑیاں اور دل کے اندیشے خزاں گزیدہ زرد پتے۔

دروازہ پراسرار چرچراہٹ سے کھلا اور شور سے بند ہو گیا۔ اس نے چٹخنی چڑھنے کی آواز سنی۔ تنہا کمرہ' وہ اکیلی ہے اور یہ اجنبی مرد...... مگر نہیں یہ تو خاوند ہے...... ہائے اللہ! یہ اب کیا کرے گا؟ یہ کیا کہے گا؟...... اور اسے نائن کی نصیحت یاد آئی۔

خزاں گزیدہ پتے اب دیوانہ وار بگولوں میں گردش کھا رہے تھے۔

دولہا پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دلہن خاموش تھی' دھڑکنیں تیز' تیز سانسیں۔

دولہا نے ایک مرتبہ گلا صاف کیا۔ ''میں نے کہا'' وہ بات بالکل نہ کر سکا۔ ایک دو دفعہ پلنگ پر اس نے پہلو بدلا۔ اس کے بعد تسمے کھولنے لگا۔ گھونگھٹ میں جھکی گردن اور بھی نیچے ہو گئی۔

دولہا نے ایک مرتبہ پھر گلا صاف کیا مگر کچھ نہ بولا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز کپکپاہٹ سے مضحکہ خیز سی تھی۔ ''اجی! اپنا نام تو بتایئے!''

دلہن خاموش ہے (یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اس کے ذہن نے سوال کیا۔)

''اچھا جی' آپ کی مرضی'' وہ انداز سے بولا۔

سرخ گٹھڑی خاموش رہی۔

''اچھا نہ بولیں! میں گدگدی کرتا ہوں۔'' اس نے دھمکی دی۔ وہ گدگدی کے نام سے ہی سکڑ سی گئی۔ اس نے گدگدی نہ کی بلکہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ زرینہ نے سر اور بھی نیچے کر لیا مگر اس کا چہرہ اونچا کر دیا گیا' گو اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ چہرہ پر اپنے خاوند کی نظروں کی گرمی گرم سلاخوں کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گرم تھے۔ ان گرم ہاتھوں نے چہرہ اپنے احاطہ میں لے لیا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ان ہاتھوں کی گرمی مکھن کے مانند اس کے چہرہ کو پگھلا دے گی۔ ایک ہاتھ اس کے گال پر پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے چہرہ پر شنٹنگ کرتے انجن کی بھاپ جیسی گرم سانس محسوس کی اور دوسرے لمحے وہ ہاتھ چہرے سے ہٹ کر اس کی گردن کے گرد تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہونٹ تھے مگر جلدی کی وجہ سے ہونٹوں پر پورے ہونٹ نہ جم سکے۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ زرینہ کچھ بھی نہ کر سکی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا مگر وہ اب شکنجہ میں جکڑی تھی۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا' جسم کپکپا رہا تھا۔ سگریٹ کی بو میں بسی ہوئی سانس متلی پیدا کر رہی تھی۔ اس نے زوردار جدوجہد سے خود کو آزاد کرا لیا۔ اس کا سرخ دوپٹہ گرا پڑا تھا۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں سے پریشان ہو کر دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ لئے تھے۔ پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں اس مرد سے چار ہوئیں جو اب اس کا جیون ساتھی اور سرتاج اور مجازی خدا بن چکا تھا۔ وفور جذبات سے اس کی آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور ان سکڑی

ہوئی آنکھوں کی چمک سرخ لوہے کی مانند زرینہ کے اعصاب میں اتری جا رہی تھی۔ سیاہ رنگ نیلا سوٹ اور چوڑی سی ناک۔ وہ یہی کچھ دیکھ سکی۔ اس کے خاوند کا جسم حملہ آور ہونے والے چیتے کی مانند تنا ہوا تھا۔ اس نے جھپٹ کر بجلی گل کر دی اور ایک ہی جست میں وہ اس کے پلنگ پر تھا۔ اب اسے بات کرنے کی کہاں ہوش۔ آتے ہی اس نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ اس کے بازوؤں سے نکل چکی تھی۔ زرینہ نے پلنگ سے اٹھ کر بھاگنا چاہا مگر وہ اب پلنگ پر گرائی جا چکی تھی۔ جب زرینہ ہوش میں آئی تو اس کے خاوند نے سرہانے کی میز سے مٹھائی کی پلیٹ اٹھائی۔ آؤ یہ کھائیں۔''

وہ کھلا جا رہا تھا اور اس کے انداز میں اس جھنڈے ایسی سربلندی معلوم ہوتی تھی جو کسی ناقابل تسخیر چوٹی پر پہلی مرتبہ لہرا رہا ہو' وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''اب اٹھ بیٹھو! اور یہ مٹھائی کھالو۔'' اور زرینہ نے انکار میں گردن ہلائی تو بولا۔ ''مٹھائی کھا کر دودھ پینا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ لو اٹھو!'' اس نے ایک گلاب جامن اس کی طرف بڑھا دی' اب بھی جب زرینہ نے انکار کیا تو اس نے خود کھانا شروع کر دیا اس کے بعد دودھ کا گلاس پیا۔ اور اب جوان دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ معنی خیز انداز سے مسکرا رہا تھا۔

زرینہ میں اسے منع کرنے یا مزاحمت کی سکت باقی نہ تھی۔ صرف آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

یہ شادی کی پہلی رات تھی۔

دلہن سسرال سے واپس آئی تھی۔ اس لئے گلی محلہ کی عورتیں اور رشتہ کی خالائیں اور پھوپھیں وغیرہ بھی جمع ہو گئیں۔ زرینہ ایک ایک سے مل کر رو رہی تھی۔

ایک پڑوسن دوسری سے بولی۔ ''لڑکی پر روپ نہیں چڑھا۔ سسرال سے واپسی پر تو لڑکی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔''

''ہاں!'' دوسری نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

محلّہ کی مشترکہ خالہ ناک پر انگلی رکھے بولی۔ ''میں جب سسرال سے پہلی مرتبہ آئی تھی تو......''

مگر پہلی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''ارے خالہ! تم پر تو ابھی تک روپ ہے' بھلا کوئی تمہارا ابھی مقابلہ کرسکتا ہے۔''

''مقابلہ!'' پر زور دیا گیا تھا جس پر ایک قہقہہ پڑا۔ کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ خاوند کی موت کے بعد اس نے دل بہلانے کے لئے کچی عمر کے لڑکوں کی سرپرستی شروع کردی تھی۔ خالہ اس پر شرمندہ ہوکر کھسک گئی۔

ویسے اس کی اڑی اڑی سی رنگت اور ذہنی پریشانی کو سبھی نے محسوس کرلیا تھا۔ چنانچہ جب رات کو فرصت میسر آئی تو زرینہ کی باجی نے پوچھا۔ اس کی باجی شادی شدہ تھی اور دونوں میں بہت پیار تھا۔

''زرینہ واحد کیسا ہے؟''

زرینہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

زرینہ نے کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر ٹھوڑی میں کپکپاہٹ سی ہوئی ہونٹ بند ہوگئے اور آنسو بہنے لگے۔

''میری زری!'' اس کی باجی نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ زرینہ اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''کیا ہوا؟ مجھے نہ بتاؤ گی۔''

زرینہ نے روتے روتے اور اٹک اٹک کر گزشتہ بیتی راتوں میں جو کچھ ہوا تھا وہ کہہ سنایا۔ بعض اوقات وہ احساسِ شرم سے رک جاتی تو باجی پیار اور چمکار سے بات اگلواتی۔ سب کچھ سن کر باجی خاموش ہوگئی۔ زرینہ نے اس کی طرف دیکھا۔ باجی کو زرینہ پر بڑا پیار آیا۔ دونوں کی عمروں میں گو خاصا فرق تھا لیکن ماں کی طویل بیماری کی وجہ سے زرینہ کو اس نے ماں بن کر پالا تھا۔ زرینہ نے پوچھا ''اب تم ہی بتاؤ باجی! میں کیا کروں؟''

''کیوں؟''

''مجھے تو اپنے آپ سے گھن اور اس سے......'' زرینہ نے گھبرا کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کی باجی نامکمل فقرے کا مفہوم سمجھ چکی تھی...... وہ زرینہ کو اس بارے میں بہت کچھ سمجھانا چاہتی تھی مگر اب وہ اس موضوع پر بات کیلئے خود میں حوصلہ نہ پاتی تھی۔ ان دونوں

میں بہت بے تکلفی تھی لیکن ایسی نہیں کہ وہ اس کے ساتھ ایسے مسائل پر باتیں کر سکتی۔

زرینہ جواب طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باجی نے سر جھکا لیا۔

''باجی! کیا واقعی اس کے بغیر گزارہ نہیں؟''

''نہیں!''

''کیا تم بھی......؟''

''ہاں زری۔''

باجی کو الجھن سی ہو رہی تھی لیکن وہ جواب دینے پر مجبور تھی۔ ''ہاں زری! اکثر مرد اس وقت وحشی ہو جاتے ہیں۔ اکثر عورتیں اس کا رونا روتی ہیں۔''

''میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔''

''بس اسی کا نام شادی سمجھو!''

''توبہ ہے! خدا بچائے ایسی شادی سے۔'' زرینہ نے کہا باجی ہنس دی۔

''زری پگلی شروع شروع میں سبھی اسی طرح روتے ہیں مگر بعد میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''کتنی بری بات ہے۔''

''زرینہ تم ابھی کم عمر ہو اس لئے زیادہ پریشان ہو۔ لیکن میں شادی شدہ زندگی گزارنے کے بعد اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اس کے بغیر ماں نہیں بنا جا سکتا۔''

زرینہ نے اس کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

باجی نے کہا۔ ''روتے پیٹتے جب عورت ماں بن جاتی ہے تو پھر وہ پچھلے دکھ' درد' کراہت بلکہ نفرت تک سبھی بھول جاتی ہے۔ شادی کا انعام قدرت بچہ کی صورت میں دیتی ہے۔''

''مجھے ایسا بچہ نہیں چاہیے۔'' زرینہ جل کر بولی۔

''ہشت! ایسی بے تکی باتیں نہیں کرتے۔'' اس نے پیار سے اس کے گال پر چپت ماری۔ ''کیا تمہیں میرا منا اچھا نہیں لگتا۔''

''بہت اچھا لگتا ہے۔''

''کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارا اپنا ایک ایسا پیارا اور گول مٹول سا بچہ ہو۔ جو تمہیں ماں کہے۔''

اس نے تکلفاً انکار میں گردن ہلا دی مگر زرینہ کا دل باجی کی بات کی تائید کر رہا تھا...... اور یہ بات پھر اس کے دل سے نکل نہ سکی۔ اپنی بہن اور بعدازاں ماں کے سمجھانے کے باوجود بھی اس کا ذہن ازدواجی جنس کو تسلیم نہ کر سکا۔ پہلی رات کو واحد اس کے ساتھ جس وحشیانہ انداز سے پیش آیا اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن میں خوف اور درد کی مہر ثبت کر دی۔ زرینہ کیلئے جنس ایک سربستہ راز کی مانند تھی۔ سخت پردے والے انتہائی کٹر ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی۔ ان کے خاندان کی لڑکیوں میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر ان کی شرافت مسلّم تھی۔ زرینہ ایک ایسے ساز کی مانند تھی جس کے تاروں سے اکتساب نغمات کے لئے تھوڑی محنت اور صبر کی ضرورت تھی لیکن واحد میں انہی کا فقدان تھا۔ اسی لئے ان میں وہ پیار نہ تھا جس کی بنیاد صحت مند جنسی جذبہ پر استوار ہوتی ہے۔ شادی کے ابتدائی ماہ نئی دلہنوں کیلئے جذباتی سرمستیوں کے ہنڈولے ثابت ہوتے ہیں لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔

ڈوبتے سورج کے ساتھ ہی زرینہ کا دل ڈوبنے لگتا۔ صبح جب نماز کے وقت وہ اٹھ کر نہاتی تو دل ہی دل میں شرمندہ اور خود کو مجرم سا سمجھتی۔ جب بعض بے تکلف شادی شدہ سہیلیاں اپنے قصے چٹخارے لے لے کر بے حجابانہ انداز میں سناتیں تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ ''ہائے اللہ!'' وہ دل میں سوچتی۔ ''یہ کیسی بری ہیں جب بھی موقع ملتا ہے یہ گندی گندی باتیں شروع کر دیتی ہیں۔'' بعد میں اس نے تنگ آ کر ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ باقی سب ایسی باتوں میں اس کی خاموشی کو میسنے پن پر محمول کرتیں۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔

پھر زرینہ کو ایسے لگا جیسے خدا نے اس کی سن لی۔ واحد کو اس کی فرم نے شہر شہر گھومنے والا کام دے دیا۔ اب وہ مہینہ میں دس پندرہ دن ضرور باہر گزارتا۔ زرینہ اب بڑی خوش تھی۔ ادھر وہ عورتوں والے ہتھکنڈے بھی سیکھ چکی تھی۔ بعض اوقات وہ کام کی تھکن، سردرد، کمر درد کا بہانہ کر کے اپنی جان بچا لیتی۔ ایسے میں اسے انجانی سی خوشی ہوتی۔ جو فعل

انجان مرد اور عورت کے لئے دائمی پیار کا بندھن ثابت ہوتا ہے وہی یہاں نفرت کی خلیج کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ نفرت کبھی شعوری سطح پر نہ آتی۔ وہ اس شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی جہاں بیوی سسرال ڈولی میں جاتی تھی اور وہاں سے اس کا جنازہ نکلتا تھا۔ مذہب اور خاندانی روایات اس سے خاوند کی عزت کی متوقع تھیں اور وہ اپنے خاوند کا بہت ادب کرتی تھی۔ کوئی اسے دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے شوہر سے دلچسپی نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ میکانکی اور غیر جذباتی تھا۔ رات کو دونوں کے جسم پہلو بہ پہلو ہوتے لیکن اس کی روح کسی خوابیدہ شہزادی کی مانند جسم پر سوئیاں چبھوئے اس تمام سلسلہ سے علیحدہ رہتی۔

لڑکیاں شادی کے بعد گلستان بن جاتی ہیں۔ زرینہ ہر موسم میں خشک رہنے والی ٹہنی بن چکی تھی۔

جب اس نے اپنی بیٹی کو پہلی مرتبہ گود میں لیا تو باجی سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کی مسکراتی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ ''کیوں کیا ڈیڑھ سال کی تکلیف کا یہ انعام کافی نہیں؟''

پہلا بچہ حسب دستور میکہ میں ہوا تھا۔ تار کی اطلاع ملتے ہی واحد بھی باہر سے آ گیا۔ بچی ایسی پیاری نہ تھی' اپنے باپ کی ہو بہو تصویر تھی۔ ادھر اس کی ساس سسر اور خاوند بھی روٹھے روٹھے سے تھے۔ انہیں لڑکے کی توقع تھی' مگر لڑکی پیدا کرنے پر سسرال والوں کی نظریں اسے مجرم ٹھہرا رہی تھیں۔

جب دو تین دنوں کے بعد بچی نے پہلی مرتبہ اس کی چھاتیوں کو منہ لگایا تو مامتا ایک لطیف ارتعاش کی صورت میں اس کی رگ و پے میں دوڑ گئی۔

واحد خوش نہ تھا۔ اسے اپنا نام چلانے کے لئے بیٹے کی ضرورت تھی نا کہ کسی اور مرد کے لئے پال پوس کر جوان کی جانے والی بیٹی کی۔

زندگی اب پہلے ایسے طریقے سے گزر رہی تھی۔ صرف اتنا فرق تھا کہ اب بچی کی معصوم مسکراہٹ ہر تکلیف کا نعم البدل ثابت ہو رہی تھی۔ جب اس کے ہاتھ جسم پر لگنے سے گدگدی ہونے پر وہ ہنستی تو یہ ہنسی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوتی۔ جب وہ لپک کر اس کی گود میں آتی تو اس کا دل جھوم اٹھتا۔ بعض اوقات اس کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ اسے ساری

ساری رات گود میں لئے بیٹھی رہتی اور یوں جاگ کر اسے سکون کا احساس ہوتا۔ وہ اب تک اپنی زندگی کو نامکمل سا محسوس کرتی تھی اور بیٹی نے اسے پورا کر دیا۔ چاہنے اور چاہے جانے کی مجروح خواہشات نے اس کی شخصیت میں جو خلا پیدا کیا تھا ننھی شاہدہ نے اسے پورا کر دیا تھا۔

شاہدہ کو ٹھنڈ لگ گئی۔ پہلے بخار ہوا جواب نمونیہ میں تبدیل ہو گیا۔ واحد گزشتہ نصف ماہ سے باہر دورہ پر تھا۔ اس کے سسر نے ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس نے شاہدہ کو دیکھا اور انجکشن لگانے کے بعد کچھ ادویات دیں۔

''اس کی حالت بہت خراب ہے۔'' وہ ان کا فیملی ڈاکٹر تھا اور اسے مریضہ کے معاملہ میں بے جا تکلفات کی ضرورت نہ تھی۔ ''اگر تو یہ آج کی رات گزار گئی تو پھر انشاء اللہ خطرہ سے باہر ہو گی ورنہ......'' اس کا فقرہ زرینہ کی سسکی کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی گھر والے اسے تسلیاں دیتے رہے لیکن وہ تھی کہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے سسر نے کہا ''میں کمپنی کے دفتر تار دے کر آتا ہوں۔''

زرینہ سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ اپنی مسرتوں کے اس نوشگفتہ غنچہ پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اگر موت نے اسے چھین لیا تو وہ کیا کرے گی؟

واحد شام تک آ گیا۔ ابھی تک کمپنی اسے بیماری کی اطلاع تو بھجوا نہ سکی تھی۔ اس کا کام غیر متوقع طور پر دو دن پہلے ختم ہو گیا اور اس لئے وہ آ گیا۔

رات ہوئی تو وہ اس کی چارپائی پر آ گیا۔ زرینہ اس کی نیت سمجھ کر بولی۔ ''دیکھئے! آج شاہدہ کی طبیعت بڑی خراب ہے اور......''

''ہائیں!'' وہ بولا ''تو میں کیا کرتا ہوں' ذرا سردی لگ رہی ہے۔ میں تمہارے بستر میں ذرا سا گرم ہو لوں گا۔ کئی راتوں سے ڈھنگ سے سو بھی نہ سکا۔'' زرینہ کے احتجاج کے جواب میں اس نے کہا۔ ''ہم صرف باتیں کریں گے۔'' وہ رضائی میں اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ زرینہ کا دھیان اس کی باتوں میں نہ تھا۔ وہ تو بس ہوں ہاں کیئے جا رہی تھی۔ لیکن جب اس نے ایک دو مشکوک سے لطیفے سنائے تو وہ جلدی سے بولی۔ ''کافی رات جا چکی ہے اور آپ نے سفر کیا ہے۔ اب جا کر سو جائیں۔''

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''ابھی تو ساڑھے گیارہ ہی بجے ہیں۔ابھی سے کیسے سو جاؤں۔تم خاصی تھکی ہو آؤ میں تمہیں دبا دوں۔''

''نہیں !نہیں !!'' وہ گھبرا کر بولی۔''میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے نہ دبائیں۔''

''ارے نہیں!'' اور اس نے اسے دبانا شروع کر دیا۔

''دیکھو! خدا کے واسطے !! شاہدہ ساتھ ہے۔وہ جاگ جائے گی۔''

''وہ نہیں جاگتی!'' وہ بولا۔

''آپ کیسے ظالم ہیں!''

وہ زور سے ہنسا ''ظالم تو تم ہو۔''

زرینہ کو اس کی ہنسی بہت بری اور بے موقع لگی۔ وہ اسے تھپڑ مار کر ہٹانا چاہتی تھی لیکن اس کی مزاحمت واحد کی آتش شوق کو اور بھی زیادہ بھڑکا رہی تھی۔اس سے پہلے وہ لاتعلقانہ انداز میں شہتیر بنی رہتی لیکن آج پہلو میں بیمار بیٹی کی وجہ سے وہ کسی طرح بھی قابو میں نہ آ رہی تھی اور پھر اچانک شاہدہ زور زور سے رونے لگی۔زرینہ نے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانا چاہا مگر وہ اب اسے نہ چھوڑ سکتا تھا۔آج اسے واحد نا قابل برداشت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔پہلی رات کی مانند آج پھر اپنی بے بسی پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔شاہدہ رو رہی تھی۔روئے جا رہی تھی۔وہ خود کو نیم بے ہوشی کی حالت میں محسوس کر رہی تھی اور اسے شاہدہ کے خاموش ہونے کا کچھ احساس سا تھا۔جس پر خاوند کی تیز تیز اور گرم گرم سانسوں کی بوچھاڑ غالب آ چکی تھی۔

جب رات کے پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلی تو واحد اپنے پلنگ پر خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر شاہدہ کو ٹٹولا جس پر سے رضائی اتری ہوئی تھی۔ بیٹی کے جسم کی ٹھنڈک ماں کے اعصاب سے ہوتی ہوئی دل میں کیل بن کر گڑ گئی۔

O.....O.....O

آخری سبق

ماں نے صحن میں دو قدم چل کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے دہلیز پر رکے پایا۔ ''ارے آ جاؤ رک کیوں گئے۔''

حامد نے صحن میں بیٹھے لڑکے لڑکیوں کو نظر بھر کر دیکھا جو اب کتابوں پر سے گردنیں اٹھا کر اسے گھور رہے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکن میں تیزی پیدا ہو گئی۔ پاؤں جیسے دہلیز نے جکڑ لیے۔

حامد نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا۔ پھر ان بچوں کو جو اب اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے اور پھر استانی جی کو۔ چوڑے کندھے بھرے بھرے ہاتھ پاؤں والی لمبی تڑنگی استانی کو دیکھ کر تو اس کے ویسے ہی چھکے چھوٹ گئے۔ وہ سب اسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

''بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔''

ماں نے اب لاڈ میں آ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لا کر استانی جی کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ مجرم بنا سر جھکائے کھڑا تھا۔ تپتے گال اور سرخ چہرہ لئے اسے بچوں کی ہنسی اپنی پشت پر کانٹوں کی طرح چبھتی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے لمبے قد کے باوجود وہ خود کو بونا محسوس کر رہا تھا۔ ایسا بونا جسے ابھی قلابازی لگانے کو کہا جائے گا اور وہ اس معمولی سے کام میں بھی ناکام رہے گا۔ دھڑام سے گر پڑے گا اور پھر سب اس پر دل کھول کر ہنسیں گے۔

شاید وہ ہنس ہی رہے تھے مگر نہیں اب کوئی بھی نہیں ہنس رہا تھا۔ استانی جی کی ایک ہی نگاہ نے ان سب کی پھسیں پھسیں بند کرادی تھی مگر وہ ابھی تک مجرم بنا کھڑا تھا۔ جس کا سر اور آنکھیں استانی جی کے سانولے پاؤں پر ٹکی تھیں۔ کھلی چپل میں سانولے پاؤں اس وقت کشش ثقل کا کام کر رہے تھے۔

''ارے واقعی!'' استانی جی بولیں۔ ''یہ تو بہت ہی شرمیلا ہے۔'' یہ سن کر شرم سے وہ اور بھی سکڑ گیا اور ماں فخر سے بولی۔ ''یہ میرا حامد سات بیٹیوں جیسا ہے۔'' اس پر سب کی پھسیں پھسیں پھر اس کی پشت پر سویوں کی طرح چبھی۔ مگر استانی کی ایک ہی نگاہ نے سب کو سن کر دیا۔ باقی بچے سن ہوئے یا نہ ہوئے مگر حامد یقیناً سن ہو گیا۔ دراصل سن رہنا اس کی خصلت تھی۔ غالباً اس کے خون میں سرخ خلیوں کے علاوہ کچھ ایسے خلیے بھی تھے جو اسے خواہ مخواہ سن رکھتے تھے' ڈرنے کی بات ہو نہ ہو وہ خود بخود ہی ڈرا رہتا تھا۔ خاص طور پر لڑکیوں سے تو اس کی جان جاتی تھیں۔ اسے یہ لڑکیاں عجیب وغریب اور پراسرار قسم کی مخلوق نظر آتیں جن سے بچنے ہی میں عافیت ہو اور اب جو استانی جس کی صورت میں وہ ایک بہت بڑی لڑکی کے حضور پیش ہوا تو خود کو مجرم سمجھنا لازم تھا۔ سو نظریں ابھی تک سانولے پاؤں پر ہی تھیں۔

اس کی ماں جھنجھلا کر بولی ''اوکھوتیا۔''

اس پر اس کی پشت پر زور سے سویاں چبھیں۔

استانی جی بولیں۔ ''رہنے دیں۔ مت ڈانٹیں اسے' ابھی نیا نیا ہے اس لئے گھبرا رہا ہے۔'' اس نے مشکور ہو کر استانی جی کو دیکھا تو انہیں اپنی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے پایا۔ اس مسکراہٹ سے اس کی جان میں جان آئی مگر مکمل طور پر نہیں۔ ماں کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے چنانچہ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ''بڑا شرمیلا ہے میرا حامد۔''

قصور حامد میاں کا بھی نہ تھا۔ ماں دنیا سے خوفزدہ تھی اس لئے مرغی کی طرح حامد کو اپنے پروں میں لئے رہتی۔ وہ وقت جو بچوں کے ساتھ باہر گلی میں کھیلنے میں گزارنا چاہیے تھا وہ صرف گھر میں ماں اور خالاؤں اور چچیوں کے ساتھ گزارتا۔ وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کراتا بلکہ بعض کام تو اسے بے حد پسند تھے۔ مثلاً سل بٹے سے مصالحہ پیسنا' ماں کی

سہیلیاں آتیں تو یہ ان کے دائرہ کے قریب ہتھیلی پرٹھوڑی ٹکائے ان کی باتیں سنتا رہتا۔ ساسوں کی باتیں، خاوندوں کی باتیں، پڑوسنوں کی باتیں۔ کچھ سمجھ پاتا۔ بہت کچھ سمجھ میں نہ آتا مگر باتوں میں مزا ضرور آتا۔ ان باتوں میں اس کے لئے سب سے زیادہ مزا تھا اور یہی اس کی سب سے بڑی تفریح بھی۔ پھر یہ ہونے لگا کہ کوئی ایک کہتی۔ ''دیکھوتو کیسے چسکا لے رہا ہے۔''

''چلو حامد بیٹے۔'' اس کی ماں چمکار کر کہتی۔

اور وہ عورتوں کی جنت سے جلاوطن کر دیا جاتا۔

پھر اس نے چھپ چھپ کر باتیں سننا شروع کر دیں۔ گو اب بھی بہت سی باتیں پلے نہ پڑتیں مگر یوں چھپ کر سننے میں مزا اور بھی زیادہ تھا۔ چنانچہ وہ اور بھی زیادہ رگڑ کر مصالحہ پیسنے لگ گیا۔

پھر اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کا قد بے حد طویل ہو چکا ہے اور اپنی ماں کے منہ سے نکلی باتیں اسے مکمل طور پر سمجھ میں آ گئیں۔ اس رات وہ خواب میں بلاوجہ ہی روتا رہا۔ اگلی صبح اس نے مصالحہ پیسنے سے انکار کر دیا اور تب ماں کو احساس ہوا کہ بیٹا خاصا بڑا ہو چکا ہے۔ اب اسے پڑھانا چاہیے اور تعلیم کے لئے استانی کے گھر سے بہتر بھلا اور کون سا گھر ہو سکتا تھا۔

استانی جو محلّہ بھر میں آپا جی اشرف کے نام سے مشہور تھی۔ غریب کی جورو تھی۔ آٹھویں پاس تھی اور پرائمری تک کے بچے پڑھاتی تھی۔ کیونکہ باقی عورتیں آٹھویں پاس کجا آٹھویں فیل بھی نہ تھیں اس لئے استانی جی محلّہ بھر کی مشیر تھیں۔ عمر زیادہ نہ تھی مگر محلّہ بھر کی کنواریوں، دلہنوں، سوکنوں، ساسوں اور متفرق عورتوں کے دکھ سکھ کی کہانیاں سن سن کر بڑی بوڑھیوں سے زیادہ تجربہ کار اور سمجھ دار بن چکی تھی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خفیہ باتوں کی پٹاری بند رہتی تھی۔ جب کوئی ہونٹوں پر آنچل رکھے سر جوڑے بیٹھی سرگوشیاں کرتی نظر آتی تو یقیناً وہ خفیہ مذاکرات ہوتے اور اللہ کے فضل سے ایسا بابرکت محلّہ اور ایسی نیک بیبیاں تھیں کہ خفیہ مذاکرات کی کبھی کمی محسوس نہ ہوتی۔ بلاشبہ وہ محلّہ کی مقبول ترین عورت تھی۔ اس لئے کہ وہ ان نایاب عورتوں میں سے تھی جن کے کان کنویں جیسے ہوتے ہیں کہ بات گہری

تہہ میں گم' بڑی سے بڑی بات سنتی مگر کیا مجال جو چہرہ پر لہرآئے۔وہ سب کی رازدار تھی مگر اس کی رازدار کوئی نہ تھی۔اس نے اتنی باتیں اور ایسی ایسی حرکتیں سن رکھی تھیں کہ ایک مرتبہ اگر زبان کھول دے تو سالوں تک محلّہ والے تھانے کچہریاں بھگتتے پھریں۔عورتیں اس کے احسان کا بدلہ یوں چکاتیں کہ اپنے بچے پڑھنے کو بھیجتیں۔عید شبرات کو تحفے ملتے تو شادی بیاہ کے موقع پر جوڑے اور گھر میں اچھی چیز پکتی تو اسے بھیجنا نہ بھولتیں اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کی بدخوئی نہ کرتیں۔بلاشبہ وہ محلّہ کی مقبول ترین عورت تھی۔اسی طرح وہ بچوں کی مقبول ترین استانی بھی تھی اور حامد کے لئے سب سے پسندیدہ ہستی!اتنی کہ اس کے مقابلے میں اپنی ماں کچھ بھی نہ لگتی۔چنانچہ اس نے گھر میں ماں کے ساتھ زنانہ کام کرانے بند کر دیئے۔وہ جب کچھ کرنے کو کہتی یہ جھلا کر بولتا۔

''اماں دیکھ نہیں رہی میں آپا جی کا کام کر رہا ہوں۔''

اگر چہ اب اماں کو مصالحہ خود پیسنا پڑتا' کوٹھے پر جا کر دیواروں پر دھلے کپڑے خود کھولنے پڑتے اور اسی طرح کے چھوٹے موٹے کام جن میں حامد کو عجیب طرح کی لذت اور پھر اس سے مسرت ملتی تھی کہ اب اس کے لئے غیر ضروری اور بےکار ہو کر رہ گئے تھے۔ ہاں!استانی جی کے کاموں سے اس کی دلچسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔سب بچے چلے جاتے مگر وہ وہیں رہ جاتا۔اس کے لئے بازار سے بھاگ بھاگ کر سودا لاتا۔باورچی خانہ میں مصالحے کے ڈبے قرینے سے سجاتا' تکیوں کے غلاف تبدیل کرتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر سے بھی زیادہ باریک مصالحہ پیستا' پیستا جاتا' حتیٰ کہ ہاتھ میں پکڑا بٹہ سل اور ان دونوں کے درمیان مصالحہ یک جان ہو جاتے مگر وہ دیوانہ وار پیسے جاتا۔جب شام کو کام کاج سے تھک کر استانی جی لیٹ جاتیں تو پولے پولے ہاتھوں سے سر دباتا اور سخت سخت ہاتھوں سے ٹانگیں۔

استانی جی کے میاں عمر میں بڑے تھے اور سدا کے روگی۔گھر میں ہوتے تو ان کی کھانسی کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہتی۔

حامد کو آپا جی جتنی اچھی لگتی تھیں ان کے میاں صاحب اتنے ہی برے لگتے تھے۔ وہ گھٹنوں پر کتاب دھرے دونوں کا موازنہ کرتا رہتا۔استانی جی کا چہرہ کیسا گول مٹول

کٹورے سا تھا جب کہ میاں صاحب کا لمبوترا چہرہ' چہرہ نہ تھا بٹہ تھا۔ استانی جی کے چہرہ پر کیسے نمک گھلا تھا جب کہ میاں جی کے چہرہ پر چیچک کے داغ دیکھ کر گندی سِل کا خیال آتا۔ استانی جی ہنستی تو پھولے پھولے گالوں میں گڑھا پڑ جاتا جب کہ بڑی ہوئی شیو سے میاں جی کے پچکے گالوں کے گڑھوں میں چیونٹیاں چلتی محسوس ہوتیں۔ استانی جی مسکراتی تو سفید چمکیلے دانت لشکارا مارتے جب کہ پورا منہ کھول کر کھانسنے پر میاں جی کے گندے دانت اور پیلے مسوڑھوں کے پیچھے سیاہ بلغمی حلق کا غار نظر آتا۔ استانی جی کے لمبے بال دیکھ کر ایک دن اس نے کہا۔ ''آپا جی میں تیل لگا دوں۔''

''تم۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں آپا جی۔'' وہ جوش سے بولا۔ ''اپنی ماں کے سر میں میں ہی تیل لگایا کرتا ہوں۔''

''اچھا' تو آؤ۔''

اس نے ہتھیلی میں تیل ڈالا اور مانگ کے بیچ میں سے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے تیل کی باریک دھار سر پر ڈالی اور پیشتر اس کے کہ تیل ادھر ادھر ہوتا اس نے اسے بالوں میں سمونا شروع کر دیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ وہ ہاتھ ہلاتا گیا' اس کے نرم نرم ہاتھوں کا لمس سر کے ذریعہ سے تمام اعصاب میں سکون کی لہریں دوڑا رہا تھا۔ یوں کہ آنکھیں نیند سے بوجھل محسوس ہونے لگیں اسے بھی یہ احساس ہو چکا تھا کہ یوں تیل لگانا استانی جی کو بھایا ہے۔ استانی جی کو یوں مزا دے کہ اسے جو خوشی حاصل ہو رہی تھی اس کی وجہ سے اس کے ہاتھوں میں اس کا دل سمٹ آیا کہ تیل کے قطرہ قطرہ میں اس کا وجود شامل ہو گیا۔

وہ صبح سب سے پہلے آتا۔ پھٹی دری پر چپلی میں جھولتے سانولے پاؤں کے قریب تر بیٹھتا اور سب سے آخر میں جاتا۔ استانی خوش تھی کہ اتنا تابعدار شاگرد آج تک نہ ملا تھا اور شاگرد کا یہ حال تھا کہ اس کا بس نہ چلتا ورنہ اپنا بستہ بغل میں دبا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے استانی جی کے سامنے بیٹھا رہتا۔

وہ اب بھی ویسا ہی شرمیلا تھا۔ اس کا اب بھی زیادہ باتیں کرنے کو جی نہ چاہتا تھا

بلکہ کبھی کبھی تو بالکل ہی بولنے کو جی نہ چاہتا۔ بس پلکیں جھپکائے بغیر استانی جی کے کھلتے لبوں' سفید دانتوں اور ان میں بل کھاتی ننھی سی گلابی زبان کو تکتا رہتا۔ وہ اب بھی محلے کے لڑکوں سے کھیلنے میں شرم محسوس کرتا۔ اس کا گھر میں بھی کھیلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بس گھٹنوں پر کتاب رکھے پہروں بیٹھا سبق یاد کرتا رہتا۔ ہونٹ رٹنے میں محو ہوتے۔ آنکھیں کہیں اور' اور ذہن میں کچھ اور۔

اور پھر ایک رات اس نے عجب خواب دیکھا۔ وہ سر میں تیل لگا رہا ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ سر کس عورت کا ہے۔ مگر بالوں میں تیل کی دھار گرانے سے پہلے ہی بال سانپوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے' ہلتے' کلبلاتے' جھومتے' وہ ان سے ڈرتا بھی ہے لیکن اسے یہ بھی احساس ہے کہ اگر وہ اسی طرح تیل انڈیلتا رہا تو یہ سانپ مر جائیں گے۔ چنانچہ وہ نئے عزم سے بوتل اٹھاتا ہے مگر بوتل کو ہاتھ میں لیتے ہی جیسے ہوا بھرا لفافہ پھٹ گیا۔ آنکھ کھلنے پر اسے خود سے گھن آ رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کر اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا۔ اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ وہ اب بہت ہی بڑا ہو گیا ہے۔ استانی جی نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اسے جو سکھا سکتی تھی سکھا چکی ہے اور یوں وہ اسکول پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو ڈرنا ضرور سیکھ لیا' ماسٹروں سے' ان طاقتور لڑکوں سے جو چھوٹے بچوں پر حکومت کرتے تھے' کتابوں سے اور سب سے بڑھ کر خود اپنے جسم سے۔

آپا جی کے ہاں جانا موقوف نہ ہوا تھا۔ مصالحہ پیسنے یا بالوں میں تیل لگانے کے لئے نہیں بلکہ ویسے ہی انہیں سلام کرنے کو' اسے یہاں آ کر عجیب سے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ سکول اور کلاس روم میں سکڑا سہما سہا رہتا مگر یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا گویا اب دنیا بھر کی پریشانیوں سے محفوظ ہو گیا۔ وہاں بیٹھ کر سکول کا کام کرتا اور سب سے بڑھ کر سکول کے لڑکوں کی اور ماسٹروں کی باتیں کرتا اور یوں دونوں کی شعوری کاوش کے بغیر استانی اور شاگرد میں دوستی کے ایک نئے رشتہ نے جنم لے لیا۔ وہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی۔ اسے مشورے دیتی۔ اونچ نیچ سمجھاتی اور وہ سن کر سر ہلاتا رہتا۔ محلّہ کی عورتوں کی بک بک سننے کے بعد اور

بچوں سے مغز ماری کے بعد حامد سے گفتگو اسے بھی بہت اچھی لگتی۔ چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہتی۔ میاں کی بیماری کی باتیں' کپڑوں کی باتیں' زندگی کے دکھ سکھ کی باتیں۔

حامد کے لئے دن میں دوست بنانا ناممکن ہو چکا تھا اور رات کے خوابوں سے پیچھا چھڑانا بھی ناممکن ہی ہو چکا تھا۔

اور پھر اچانک ہی جیسے جھنجھوڑ کو اسے سہانے خواب سے بیدار کر دیا گیا۔ اس کی ماں کو اچانک یاد آ گیا کہ اب وہ بہت ہی بڑا ہو گیا ہے کہ تعلیم ختم کر کے ملازمت کر رہا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کی شادی سے نہیں روک سکتی۔ روکنا کس نے تھا' بلکہ استانی جی نے تو ایک رشتہ بھی بتا دیا' حامد نے بہت شور مچایا کہ اس نے صرف میٹرک پاس کیا ہے' اور معمولی سا کلرک ہے اور ابھی انیس سال ہی کا ہے۔ اس کی کسی نے بھی نہ سنی۔ یہ سب خواب محسوس ہو رہا تھا۔ مہندی کی رسمیں' برات' مولوی صاحب کے منہ سے ادا ہوتے ہوئے مقدس کلمات' کھانا' مبارکبادیں اور پھر۔ کمرہ میں ایک اجنبی عورت' سرخ جوڑا' مہندی والے ہاتھ' ٹکے والا ماتھا اور......اور......وہ رو رہی تھی' وہ رونے کے قابل نہ رہا تھا۔

شادی کے سہانے سپنے کی تعبیر یہ نکلی کہ دلہن نے واپس آنے سے انکار کر دیا' عورتوں کی زبانیں سرگرم عمل ہو گئیں۔

استانی جی اس کی ماں سے ملیں' پھر دلہن سے ملیں۔ وہ سب سے زیادہ پریشان تھیں کہ لڑکی انہوں نے پسند کی تھی اور حامد نے ان کے کہنے پر ہاں کی تھی۔ سب ان کی عزت کرتے تھے مگر ابھی ڈور کا سرا کہاں سے ملے۔

شادی کے بعد سے حامد صبح سویرے کام پر چلا جاتا اور رات گئے گھر آتا اس دوران اس پر کیا بیتتی؟ کسی کو نہ معلوم تھا۔ اس کا کوئی دوست بھی نہ تھا۔ استانی جی کے گھر کا اس نے رخ نہ کیا تھا۔

دفتر میں اس کی طبیعت بہت پریشان ہوئی تو چھٹی لے کر نکل آیا مگر جائے کہاں؟ بس سٹاپ پر بیٹھا سواریوں کی بھیڑ دیکھتا رہا۔ دیواروں پر لگے پوسٹر اور لکھے

اشتہارات پڑھتا پھرا، سینما میں تصویریں دیکھتا رہا، آخر تھک تھکا کر سر جھکائے سوچ میں ڈوبا جو چلا تو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ کب اور کیسے وہ استانی جی کے گھر آ پہنچا۔ وہ دہلیز میں مجرم سا بنا کھڑا تھا۔ وہ صحن کے کونے میں چولہے پر بیٹھی تھی، بچے جا چکے تھے مگر وہ پھٹی دری ابھی تک لپیٹی نہ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے نظریں دوڑاتا رہا۔ تب اچانک وہ آگے بڑھا اور اس نے وہ دری لپیٹنی شروع کر دی۔ استانی جی خاموشی سے دیکھتی رہی مگر اسے منع نہ کیا۔ اس نے دری لپیٹ کر وہیں کونے میں رکھی جہاں وہ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی، کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر اس کے چہرے پر ایسی کیفیت تھی کہ خاموش رہی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ حامد نے بولنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر کھلے ہونٹوں سے الفاظ نہ نکلے۔ صرف ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی اور اگلے لمحے وہ استانی جی کے گھٹنوں پر سر رکھے رو رہا تھا۔ سسکیوں سے اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی پیٹھ سہلاتی رہی۔ دھیرے دھیرے وہ سکون پذیر ہوتا گیا اور آنسو رک گئے تھے مگر وہ اب بھی سوکھی سسکیاں لے رہا تھا اور پھر وہ خاموش ہو گیا مگر ابھی تک اس کے گھٹنے سے لگا بیٹھا تھا۔ آنسوؤں نے اس کی شلوار گیلی کر دی تھی۔

وہ خاموش تھی اور خاصی دیر تک خاموش رہی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لی۔ اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اندر کمرے میں لے گئی۔

O.....O.....O

کاسانوا:1972ء

دبلا جسم' لمبا قد' رنگ میں نمک کی گھلاوٹ' زرد لپ اسٹک میں گھلے بھرے بھرے ہونٹ' دیوداسیوں کے مجسّموں میں بنے ہوئے مگر جنسی ہونٹ' لمبی گردن پر سنہری بالوں کا ڈھیر' سنہری آبشار بنا کر کے نیچے ابھرتی گولیاں چومتا' سبز رنگ کی ساڑھی کے ساتھ اس کی سبز آنکھیں دیکھ' شکار کی تاک میں گھنے جنگلوں میں چھپی چیتے کی مادہ کا خیال آتا۔ اس سبز ساڑھی کے ساتھ اس نے جوگیا رنگ کا بلاؤز پہنا تھا۔ میرے خدا! کیا اس عورت کو اپنے جسم پر سجے رنگوں کے بعد بھی مزید رنگوں کی ضرورت تھی۔ میں نے رنگوں کا ایسا عجیب امتزاج کبھی نہ دیکھا تھا۔ سانولے رنگ کے ساتھ سنہری بال اور سبز آنکھیں تو ویسے ہی ناپید ہیں اس پر رنگوں کا انتخاب۔ پاؤں میں سرخ جوتی تھی تو پرس نیلی بروکیڈ کا میرے خدا! یہ عورت کس رنگ کو کس رنگ کے ساتھ میچ کرتی ہے اور اگر میچنگ کا یہی معیار ہے تو میں نے بدرنگ تمکین کو دیکھ کر سوچا یہ اس کے ساتھ کس رنگ میں میچ کرتی ہے۔ کافی بنانے جھکی تو جوگیا قوس میں سے سانولی چھاتیاں پاؤڈر میں ڈوبی نظر آئیں کون جانے اس پاؤڈر کا کیا رنگ ہوگا۔ میں نے تمکین کی طرف دیکھا مگر اس کے بے ضرر چہرہ سے ظاہر تھا کہ کم از کم وہ تو اس سے لاعلم ہی ہے۔

اسے آنکھ بھر کر دیکھنے سے آنکھوں میں رنگوں کے غبارے اڑنے لگے!

اس عورت کو تو میں نے صرف پندرہ منٹ پہلے سے جانا تھا لیکن تمکین کالج کے زمانہ کا دوست تھا۔ وہ بی اے میں فیل ہو کر اپنے باپ کے کاروبار کا گدی نشین ہوا تو میں

نے پاس ہو کر اورینٹل کالج کا رخ کیا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر رشک کرتے ہیں وہ میری ایم اے اردو کی ڈگری اور افسانہ نگاری پر اور میں اس کی مرسڈیز پر! شاید محرومی کا پیدا کردہ یہ رشک ہی باہمی کشش کی بنیاد ہو یا پھر اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم کبھی کبھار ملتے ہیں وہ کراچی میں ہے میں لاہور میں' اور شاید آٹھ سو میل کے اس درمیانی فاصلہ پر ہمارے خلوص کا انحصار ہو۔ بہر حال اتنا ہے کہ ہم دونوں پر خلوص دوست ہیں اور اسی لئے میری کراچی آمد پر اس نے مجھے ایک مہنگے سے ہوٹل میں کھانے پر بلایا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ تمکین غیر شادی شدہ ہے اس لئے اس کے ساتھ رنگوں کا ایک میلہ دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔ تمکین نے غیر رسمی انداز میں کہا۔

''یہ ناہید ہے۔''

یہ ایسا انداز تھا کہ اس سے بیوی' بہن' داشتہ' پڑوسن' شاگرد...... ہر ایک کا تعارف کرایا جا سکتا تھا۔ ناہید نے ماتھے پر ہاتھ کر سلام کیا جو مجھے بہت اچھا لگا۔ دراصل مجھے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرنے والی عورتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

جب وہ دوسری مرتبہ لیڈیز روم گئی اور میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ''مرے کیوں جا رہے ہو میں سب کچھ بتاتا ہوں۔''

''میں نے تو کچھ نہیں پوچھا۔''

''میں سب سمجھتا ہوں' تم اس دوران میں صرف اسی کے بارے میں سوچتے رہے ہو۔''

میں نے مسکرا کر کہا ''اس کے بارے میں تو کم' البتہ یہ ضرور سوچتا رہا کہ تم اس سے کس رنگ میں میچ کرتے ہو۔''

اس کے منہ سے گالی اور قہقہہ بیک وقت نکلے' ''اس کے رنگوں کا انتخاب اچھا ہے نا؟''

''ان تمام رنگوں میں اصل کون کون سے ہیں۔''

''بال تو اس نے ڈائی کرائے ہیں باقی سب اصل ہے۔''

''آنکھیں واقعی سبز ہیں۔''

''ہاں۔''

''کنٹیکٹ لینز تو نہیں۔''

''نہیں تو۔''

''سوچ لو۔''

''مجھے پتہ نہ ہوگا۔'' اس کے لہجہ میں بے پناہ اعتماد تھا۔

''کمال ہے۔ سانولے رنگ پر سبز آنکھیں۔ کمال ہے۔''

''ہے نا؟'' وہ کسی بچہ کی طرح خوش ہو کر بولا۔

''اب ایک بات اور بتا دو۔''

''ہوں۔''

''یہ کیا لگتی ہے۔''

''تمہاری ماسی۔''

یہ گفتگو جو ناہید کی واپسی پر ادھوری رہی اگلے دن مکمل ہوئی کہ وہ نہ تھی۔

''وہ میری سیکرٹری تو صرف اس لئے ہے کہ ہر وقت میرے ساتھ رہ سکے۔''

''تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔''

''شادی؟'' اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا اور نتھنوں سے دھوئیں کی لکیر نکالتے ہوئے بولا...... ''شادی اتنی آسان نہیں۔''

''گھر والوں کی مخالفت؟''

''وہ تو شاید اتنی نہ ہو۔''

''تو پھر؟''

''پھر۔'' وہ خاموش میز کو گھورتا رہا۔ ''بات یہ ہے کہ میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا مطلب یہ ٹھیک نہیں ہے؟''

وہ پھر خاموشی سے میز کو گھورتا رہا۔ پھر ایش ٹرے میں پڑے سگریٹ کو چھوڑ کر نیا سگریٹ سلگایا۔ پھر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کیا اور پھر مجھے' چہرہ پر الجھن تھی۔

''یہ کرپٹ ہے کیا؟''

''کرپٹ۔'' اس نے ایسے دہرایا جیسے اس لفظ کا ذائقہ زبان پر محسوس کر رہا ہو۔ ''نہیں۔ کرپٹ تو نہیں۔ کم از کم اس معنی میں تو نہیں جس میں عام لوگ کرپٹ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔'' میں کچھ نہ سمجھا اس لئے خاموشی سے اس کا منہ تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد نیا سگریٹ سلگا کر اس نے کہا۔ ''تم افسانہ نگار ہو شاید اس بات کو سمجھ سکو۔ کچھ عورتیں ہوتی ہیں کہ ساری عمر خاوند کی تابعدار رہتے ہوئے بھی وہ خیالوں اور تصورات میں اس سے بے وفا رہتی ہیں' یا اس سے نفرت کرتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتیں یا وہ اتنی بے بس ہوتی ہیں کہ ایک مرد اور ہزار مردوں میں فرق محسوس کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتیں۔ ہے نا؟''

''ہاں۔''

''ایسی عورتوں کی وفا' محبت یا جنسی تابعداری ایک طرح کا کیموفلاج ہے' بدرنگ چہرہ پر خوش نما نقاب سمجھ لو اس لئے میں ایسی عورتوں کو ان معنی میں وفادار نہیں سمجھتا جن معنی میں ہم وفادار عورت کی بات کرتے ہیں۔ سمجھے؟''

''سمجھ گیا۔''

''اب اس کے برعکس کچھ عورتیں ایسی ملتی ہیں جنہیں عرف عام میں بے وفا' فلرٹ یا کرپٹ کہا جاتا ہے ان میں کچھ تو واقعی ایسی ہوتی ہیں لیکن کچھ۔ آٹے میں نمک سمجھ لو۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو اپنی کرپشن میں بھی بہت پرخلوص ہوتی ہیں۔ سمجھے؟''

''نہیں۔''

''اسے تم ناہید کی مثال سے ہی سمجھو۔ اس کی شہرت اچھی نہیں۔ آزاد زندگی بسر کر رہی ہے۔ میرے پاس آنے سے پہلے بھی یہ ادھر ادھر پینگی کرتی رہی ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ مجھ سے پیشتر یہ جن مردوں کے ساتھ رہی ان کے ساتھ یہ کیسی تھی لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ یہ بیوی سے بھی زیادہ شرافت سے زندگی بسر کر رہی ہے۔''

''تو یہ ہے کرپشن میں پرخلوص ہونا۔''

وہ کچھ دیر تک خاموش سگریٹ پیتا رہا' پھر کہنے لگا ''ہم دونوں بیویوں والے نہیں اس لئے ان کے ہتھکنڈوں سے ناواقف ہیں۔''

''ہتھکنڈوں سے؟''

''ہاں ہاں ہتھکنڈے بلکہ بعض صورتوں میں تو کھلا استحصال۔'' وہ میرے پیپلز پارٹی زندہ باد کے نعرہ پر مسکرا کر بولا۔ ''میں نے شادی شدہ لوگوں سے جو باتیں سنی ہیں ان کی بنا پر میں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بیشتر گھریلو عورتوں میں تھوڑا سا رنڈی پن بھی پایا جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونک کر بولا۔

''تمہیں پتہ ہے یہ شرمیلی بیویاں خاوند کے خلاف جنس کو سب سے بڑے حربہ کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ خاوند قابو میں نہ آیا رات کو ہڑتال کر دی۔''

''تم تو بڑے تجربہ کار ہو چکے ہو۔''

وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر بولا ''مشاہدہ! مائی ڈیئر واٹسن مشاہدہ!'' اور پھر سنجیدہ ہو کر بولا' ''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ ناہید نے میرے اور اپنے تعلقات میں جنس کو کبھی نہیں آنے دیا۔''

''حالانکہ وجہ تعلقات یہی ہے۔''

''درست۔ اس نے آج تک بیویوں والے ہتھکنڈے نہیں استعمال کئے۔''

''ہو سکتا ہے تم کہے بغیر اس کی تمام ضروریات پوری کرتے ہو۔''

''جان من! ضروریات پوری ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات مزاج کی ہے' اس کی نفسیات کی ہے۔ میں اتنی دیر سے تمہیں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ مسٹریس ہونے کے باوجود وہ عادتوں کے لحاظ سے ہزار بیویوں سے زیادہ شریف ہے۔''

''پھر شادی میں کیا قباحت ہے۔''

وہ چڑ کر بولا۔ ''یار تم تو ایم اے اردو کے بعد بھی گھامڑ ہی رہے۔''

''یہ ڈگری ہی ایسی ہے تم بات سمجھاؤ''

''سنو'' وہ انگلیوں پر گنتا ہوا بولا۔ ''کئی وجوہات میں پہلی تو یہ کہ بزنس مین کا اپنی سیکرٹری کو مسٹریس بنا لینا دوسرے بزنس مینوں میں اس کی شہرت اور عزت کا باعث بنتا ہے لیکن اس کے ساتھ شادی کی تو کیا اس کے پرانے ایمپلائز مجھ پر نہ ہنسیں گے۔ دوسری وجہ کیا پتہ بیوی بن کر وہ اچھی مسٹریس بھی نہ رہے' اور میں ایک کرپٹ بیوی کے پلے بندھ جاؤں اور پھر تیسری وجہ......''

''بس! بس! میں سب سمجھ گیا۔''

(2)

باریک خط میں تیس صفحات پڑھ کر نظریں اٹھائیں تو وہ مجھے تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی ''کیسا ہے؟''

میں سچ بولنے کی تکلیف سے صوفہ پر پہلو بدل رہا تھا۔

وہ خود ہی بول اٹھی ''اچھا نہیں۔''

تمکین نے فون کر کے مجھے ناہید کے گھر پہنچنے کو کہا تھا۔ جہاں اس نے صرف سفید ساڑھی میں میرا استقبال کیا اس کا کمرہ بھی رنگوں کی بھڑک سے عاری تھا۔ سبز پردوں اور نیلے رنگ کی دری سے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ الماری ناولوں اور افسانوں کی کتابوں سے بھری تھی۔ میں نے نگاہ دوڑائی ان میں اچھے برے سبھی نام نظر آئے۔ ایک ریک پر رسالے قرینہ سے چنے تھے' میک اپ کے بغیر چہرہ کا نمک' بند گلے کا بلاؤز سفید' سادہ ساڑھی اور ننگے پاؤں۔ یہ ہوٹل والی ٹیکنی کلر عورت نہ تھی۔ چائے کے برتن بہت نفیس تھے اور میں سانولے ہاتھوں کو چائے بناتے دیکھ رہا تھا۔ چائے کا کپ یوں دیا کہ ہاتھوں سے ہاتھ نہ چھو سکیں۔ چائے بہت اچھی بنی تھی۔ میں نے چائے سے اٹھتے دھوئیں کی مہین لکیروں کے جال سے اسے دیکھا وہ سامنے صوفہ پر بیٹھی تھی۔ ''مجھے افسانے لکھنے کا بہت شوق ہے اور اسی لئے تمکین صاحب سے کہہ کر آپ کو تکلیف دی۔''

''تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ تمکین میرا بہت عزیز دوست ہے۔''

''مجھے معلوم ہے وہ آپ کی بہت تعریفیں کیا کرتے ہیں۔''

''ہاں! ہم دونوں کالج کے زمانے کے دوست ہیں۔ وہ بہت شریف ہے۔''

وہ ہنس کر بولی۔ ''جی ہاں! میں جانتی ہوں۔''

ہم خاموشی سے چائے پیتے رہے' پھر وہ بولی ''میں نے آپ کے تمام افسانے پڑھے ہیں۔'' پھر ہنس کر بولی ''تمکین صاحب آپ کے افسانوں کے سلسلہ میں مجھے بڑی عجیب وغریب باتیں سنا کر ڈرایا کرتے تھے مگر آپ تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''ہاں بےضرر آدمی ہوں اور پھرے میرے سینگ بھی تو نہیں۔''

اس نے خالی کپ دیکھا تو اور چائے بنانے لگی۔ سانولی انگلیوں میں چمچہ جیسے زندہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا ''اس سے پہلے کتنے افسانے لکھے۔''

''زیادہ نہیں۔ یہی کوئی دس بارہ۔''

''دس بارہ۔ کوئی چھپا بھی!''

''دراصل مجھے کسی پرچہ کو بھیجتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے بلکہ تمکین صاحب کے بعد آپ دوسرے آدمی ہیں جنھوں نے میرا افسانہ دیکھا ہے۔''

میں نے جھوٹ بولا ''یہ افسانہ تو بہت اچھا ہے۔''

''سچ؟''

''ہاں! آپ میں ایک اچھا افسانہ نگار بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔''

وہ خوشی سے سرخ ہو رہی تھی۔ ''سچ؟''

''بالکل۔ صرف تھوڑی سی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ تکنیک کے چند بنیادی اصول سمجھانے کی بات ہے۔'' سبز آنکھیں پلک جھپکائے بغیر مجھے گھور رہی تھیں۔ ''یہ افسانہ بہت زیادہ طویل ہے اس کی ایڈیٹنگ ہو جائے تو اچھا خاصہ افسانہ بن سکتا ہے۔''

''پھر یہ چھپ جائے گا؟''

''یقیناً۔''

''کہاں۔''

''میرے کئی دوست ایڈیٹر ہیں کسی کو بھی دیا جا سکتا ہے۔''

''نقوش میں چھپ جائے گا۔''

''وہاں تو نہیں۔'' اب سچ بولے بنا گزارا نہ تھا۔

''فنون میں۔''

''وہاں بھی نہیں۔''

''سیپ؟''

''شاید ان میں بھی نہ چھپے۔''

اس کا منہ لٹک گیا ''تو پھر کہاں؟''

''بھئی یہ میرا کام ہے۔ یہ سب بڑے پرچے ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی بہت سے پرچے ہیں۔ افسانہ چھپوانے سے غرض ہے' بس افسانہ چھپ جائے گا۔ یہ مجھے دے دو کانٹ چھانٹ کے بعد میں اس کے چھپوانے کا بندوبست کرلوں گا۔ اور ہاں! ہو سکے تو ایک اچھی سی تصویر بھی!''

''وہ کس لئے!''

''میرے لئے نہیں'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ایڈیٹر صاحب کے لئے۔''

وہ البم اٹھا لائی۔ ''اس میں سے پسند کرلیں۔''

البم میں اس کی یا اس کی سہیلیوں کی تصویریں تھیں ایک سے ایک بڑھ کر ایک' البم میں اسکے گھر والوں میں سے کسی کی تصویر نہ تھی نہ ہی اور کسی مرد کی اور نہ ہی تمکین کی! میں نے ایک تصویر پسند کرلی۔ لایٹ اینڈ شیڈ کے ساتھ اچھی خاصی آرٹسٹک تصویر تھی۔ جسے دیکھ کر میرا ایڈیٹر دوست اچھل پڑا۔ ''میں اسے ٹائٹل پر شائع کروں گا۔''

''اتنے جوش میں نہ آؤ پہلے افسانہ تو دیکھ لو۔''

''افسانہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے مجھے پتہ ہے تم نے لکھا ہوگا......''

''بھلا میں کیوں لکھنے لگا اور پھر یہ بھی کوئی شاعری ہے کہ نوخیز شاعرات کو غزلیں گھڑ گھڑ کر دیتے رہو۔''

''اچھا اچھا افسانہ بھی دیکھ لیتا ہوں۔'' مگر وہ صرف تصویر دیکھے جا رہا تھا پھر

ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ ''بڑی سیکسی ہے۔'' اور پھر چیخ کر چپڑاسی سے کہا۔ ''اے ہاف سیٹ چائے لے آؤ۔'' اور پھر تصویر سے نظریں ہٹا کر میری طرف توجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب مجھے بتاؤ تم نے اسے کہاں سے کھودا؟''

میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا ''ہوں'' وہ تصویر دیکھنے میں ایسا محو تھا کہ چائے کا کپ نیچے گرا دیا۔

نئے شمارہ میں بڑی آب وتاب سے اس کی تصویر چھپی اور ساتھ افسانہ بھی!

تمکین نے کراچی سے فون پر خوشی کا اظہار کیا۔ ناہید نے شکریہ کا لمبا چوڑا خط لکھا۔ ساتھ تازہ افسانہ اور...... تازہ تصویر!

(3)

''تم؟'' اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سادہ کپڑے بجھی بجھی سی خود اور اڑی اڑی سی رنگت ''یہاں کہاں؟''

''میں چند دنوں سے ادھر آئی ہوں۔''

''خیریت ہے؟''

''ہاں! سب ٹھیک ہے۔''

''تمکین کا کیا حال ہے' وہ نہیں آیا کیا؟''

وہ اور بجھ گئی' ''ٹھیک ہے۔ میں اب ان کے ساتھ۔ میرا مطلب ہے میں نے اب وہ فرم چھوڑ دی ہے۔''

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ عجب افسردگی طاری تھی اس پر' ''کیوں؟''

''بس ویسے ہی۔''

''تنخواہ کم تھی کیا؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''زیادہ تنخواہ والی فرم مل گئی۔''

''کیا بات کر رہے ہیں آپ۔''

میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا ''کہاں ٹھہری ہو۔''

اس نے پتہ بتایا ''اپنی ایک سہیلی کے ساتھ'' خاموش آنکھیں جھکائے بیٹھی رہی۔

''میں یہاں آپ کے علاوہ اور کسی کو نہیں جانتی'' وہ اور زیادہ افسردہ ہو گئی۔

''مجھے معلوم ہے۔''

میں نے چھٹی کر لی اور وہ سارا دن میرے ساتھ ہی رہی۔ اسے مختلف ایڈیٹروں سے ملایا' رات کا کھانا اکٹھے کھایا اور سیکنڈ شو کے بعد میں اسے اس کی سہیلی کے گھر لایا جو تاریک گلیوں میں یونہی عام سا مکان تھا' صحن' برآمدہ اور دو کمرے۔ سہیلی گھر میں نہ تھی۔

''یہ کہاں گئی۔''

''نائٹ شفٹ میں۔''

اس کے کمرہ میں اس کے دو اٹیچی پڑے تھے۔ ایک طرف پلنگ پر ملگجی چادر اور ایک پرانی وضع کی ڈریسنگ ٹیبل جس کے آئینہ میں بال تھا۔ میں اس کے بستر پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا' اس نے جماہی لی۔

''نیند آ رہی ہے کیا؟''

وہ ہنس کر بولی۔ ''اب بھی نہ آتی۔'' اور پھر گھڑی دیکھ کر بولی ''دو بج چکے ہیں۔''

ہم دونوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میں نے پوچھا۔

''تم یہاں کیسے گزارہ کرو گی؟''

''کر لوں گی'' وہ بےزاری سے بولی۔

''کیسے؟''

''ملازمت تلاش کر رہی ہوں۔''

''ملازمت۔ کیسی؟''

''میں ٹرینڈ سیکرٹری ہوں۔ شارٹ ہینڈ' ٹائپنگ وغیرہ سب کچھ آتا ہے۔ ملازمت نہ ملنے کی کیا وجہ؟''

''مگر کراچی سے کیوں آ گئی ہو؟''

''ایسی پرائیویٹ فرموں کا ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی سرکاری ملازمت تو نہیں

کہ پنشن لے کر پیچھا چھوڑو' یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' وہ خاموش اپنے ناخنوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں ملازمت کا بندوبست کرادوں؟''

''پلیز۔'' ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں میں نے نظریں جھکا کر کہا۔''ایک جگہ بندوبست ہوسکتا ہے شاید بہت زیادہ پیسے نہ مل سکیں۔''

''کس جگہ؟''

الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔''یہیں۔ اس جگہ۔ میرا مطلب ہے......''

''اوہ''

وہ خاموش ہے' میں خاموش ہوں' کمرہ کی خاموشی بوجھل ہوتی جارہی ہے۔

اس نے ایک دو اور جمائیاں لیں پھر باتھ روم میں چلی گئی۔ میں خاموش سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا۔ وہ دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح ساکت تھی۔ زرد رنگ کے مردانہ سلیپنگ سوٹ میں (غالباً تمکین کا) اس کا نمک اور بھی نکھر رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں ٹوتھ برش تھا۔ سبز آنکھوں سے چلمن سرکی' وہ بولی۔''میرا خیال تھا' آپ اب تک جاچکے ہوں گے۔''

میں گھر سے نکل کر کچھ دیر کے لئے دروازہ پر کھڑا رہتا ہوں۔ ذہن ہر طرح کے احساسات سے خالی ہے۔ پچھلے پہر کی سرد ہوا تپتے گالوں کو سہلاتی ہے' تھکن شدید تھی۔ تمام جسم جیسے اس تھکن کے بوجھ سے ٹوٹا جارہا ہو میں آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے چلتا جاتا ہوں۔ گلی کے موڑ پر ایک رکشہ رکتا ہے اس میں سے سیاہ برقع میں ایک لڑکی اترتی ہے۔ رکشہ والے کی کسی بات پر ہنستی ہے۔ وہ مجھے اور میں انہیں مشکوک نظروں سے دیکھتا ہوں۔ یہ غالباً اس کی سہیلی ہے جو اپنی نائٹ شفٹ مکمل کر کے آرہی ہے۔ میں تھکن کا مارا اسی رکشہ میں ڈھیر ہوجاتا ہوں۔

(4)

قلیل مدت میں وہ لاہور کے ادبی حلقوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی

تھی۔ ہر فنکشن میں وہ نظر آتی' ہر اخبار رسالہ کے دفتر میں وہ براجمان' افسانے پڑھ رہی ہے' بحث کر رہی ہے۔ ریڈیو کے لئے فیچر لکھ رہی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا بدقسمت ادیب ہو جس کے ساتھ اس نے چائے نہ پی ہو' ایک کے ساتھ اسکوٹر پر آتی تو دوسرے کے ساتھ کار پر واپس جاتی' ایک کے ویسپا سے گری تو چھ اخبارات میں کالم چھپ گئے۔ جب کہ ہم ایسوں کے مرنے پر دو سطر کی خبر بھی نہ چھپتی۔

وہ میرے لئے ایک الجھن بن چکی تھی' جہاں جاتا اسے پاتا لیکن اس کے چہرہ پر میں نے کبھی شناسائی کی جھلک تک نہ دیکھی۔ یہ دیکھ کر میں بھی اجنبی بن گیا۔ کسی تقریب میں آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو منہ پھیر لیتے۔ میں اسے پھٹیچر ادیبوں کے ساتھ دیکھتا اور کڑھتا۔

میرے دوست نے غزل پیش کرنی تھی اخلاقی مدد کے لئے مجھے زبردستی کھینچ کر تنقیدی نشست میں لے آیا مگر پروگرام میں ناہید کا افسانہ دیکھ کر جان جل گئی۔ اس کا افسانہ سن کر اور بھی جل گیا کہ بہت اچھا افسانہ تھا اس لئے کہ یہ کراچی تمکین اور میرے بارے میں تھا۔

اس ڈربہ نما کمرہ میں حبس سے جیسے دم گھٹا جا رہا تھا' اتنے ادیبوں کے جسموں کی گرمی' ان کی باتوں' نیتوں' سگریٹوں اور پسینوں کی بدبو۔ ایک کھڑ کھڑ کرتا پیڈسٹل تھا جو ناہید کی طرف سے چنچلا کی خوشبو لے کر آتا۔ گرمی' حبس' ناہید کا افسانہ اور اس میں میرا کردار۔ اعصابی تناؤ سے مجھے اپنا سر ضرورت سے زیادہ ہوا بھرے غبارے جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ آج وہ رنگوں کا مجموعہ بنی بیٹھی تھی۔ جس نقاد نے بھی اس کے بلاوز کی وی کو دیکھا یا سبز آنکھوں میں جھانکا اسی کی زبان سے تعریفی کلمات شروع ہو جاتے۔ خوشی سے ناہید کے چہرہ پر پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ میں یہ سب کچھ دیکھتا رہا' سنتا رہا اور سلگتا رہا۔ ایک لمحہ کو آنکھیں چار ہوئیں تو ان میں فتح کی چمک نظر آئی اور پیشتر اس کے کہ مجھے خود احساس ہوتا میں نے خود کو یہ کہتے سنا۔

''صدر محترم! آپ کی اجازت سے کچھ عرض کروں۔''

''ضرور! ضرور!!! ارشاد فرمایئے۔''

میں نے ناہید پر آنکھیں گاڑ کر کہنا شروع کر دیا۔ ''صدر محترم! خاتون کا افسانہ سنکر میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں تنقید کا معیار اتنا گر چکا ہے کہ ایسی بچگانہ تحریروں پر یار لوگ واہ وا کی گردان شروع کر دیتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس میں سستی جذباتیت اور مریضانہ ر.ومانیت کے علاوہ کیا ہے۔'' اس کے بعد جو میں نے افسانہ کا پوسٹ مارٹم شروع کیا تو ناہید کے چہرہ سے سرخی آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہوگئی' جیسے جیسے میں بولتا گیا سر کا بوجھ ہلکا ہوتا گیا اور اپنی طویل تنقید ختم کی تو اعصاب سکون پذیر تھے۔ میرے دوستوں نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور محفل کا ایسا رنگ بدلا کہ کسی کو افسانہ کی تعریف میں ایک لفظ کہنے کی بھی ہمت نہ رہی۔ اب ناہید کے چہرہ پر فتح کی جگہ شرم کی سرخی تھی' ہونٹوں کے کنارے کپکپا رہے تھے اور ٹھوڑی میں خفیف سی لرزش۔ اس نے سر اٹھایا تو مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا اب سبز جنگلوں پر گھٹائیں منڈلا رہی تھیں۔

اگلے دن فون آیا ''میں ناہید ہوں۔''

''ہوں۔''

''افسانہ واقعی اتنا برا تھا؟''

''میں میٹنگ کے بعد تنقید نہیں کیا کرتا۔''

ایک لمحہ کو وہ خاموش رہی پھر بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ آپ اسے بہت پسند کریں گے۔''

''وہ کیوں؟''

''یہ میرا اپنا افسانہ جو تھا۔''

''اچھا! مجھے علم نہ تھا کہ تمہارا اپنی بھی کوئی افسانہ ہے۔''

پھر خاموشی' اس کے بعد وہ بولی ''آپ نے اس کی تکنیک کی بھی بہت سی غلطیاں نکالی تھیں اگر۔ اگر آپ کوئی وقت نکال سکیں...... میرا مطلب ہے جب آپ کو سہولت ہو تو آپ صحیح مشورے دیں۔''

''کیسے مشورے؟''

''تکنیک کے بارے میں۔''

''یہ تو جب تک دوبارہ نہ لکھا جائے' خاص طور پر اس کا انجام اس وقت تک یہ معقول افسانہ نہیں بن سکتا۔''

''تو آپ کے خیال میں نظر ثانی کی ضرورت ہے؟''

''بالکل۔''

''تو ٹھیک ہے۔ میں اب آپ کے مشورے پر عمل کروں گی۔''

''گڈ۔ دیکھو! تم اب تک غلط لوگوں کے ساتھ رہی ہو' ان سے تمہیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے اتنے عرصہ میں تو میں تمہاری کتاب چھپوا چکا ہوتا۔''

''کتاب؟''

''اور کیا۔ کئی ناشر میرے دوست ہیں' گو آج کل پلے سے پیسے دیکر افسانوں کی کتاب چھپوائی جاتی ہے لیکن پھر بھی میں تمہاری کتاب چھپوا ہی دیتا۔ اس کا دیباچہ بھی میں لکھ دیتا' بڑا شاندار ایسا کہ ہمیشہ کے لئے اسٹیبلش ہو جاتی۔''

''سچ؟''

''اور کیا۔''

''تو پھر آج آ جایئے۔ افسانے کا اختتام اب بھی بدلا جا سکتا ہے۔''

''کہاں ٹھہری ہو ان دنوں؟''

''وہیں۔''

''جہاں تھی؟''

''جہاں تھی۔''

رات کو اس کے گھر پہنچا تو دروازہ کھلا تھا اور نائٹ شفٹ والی سہیلی شفٹ پر تھی۔ میں نے ڈیوڑھی کا دروازہ احتیاط سے بند کر دیا اور دبے پاؤں اس کے کمرہ کی طرف اندھیرے میں بڑھا۔ کمرہ کا دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ میں دہلیز پر رک گیا' کمرے کے اندھیرے میں لومینس لپ اسٹک لگے دو ہونٹ جیسے معلق تھے۔ میں ایک قدم چلا دوسرا' تیسرا چوتھا اور اب ہونٹ میرے سامنے تھے اور ان ہونٹوں کی مالک کے جسم پر چنبیلی کی خوشبو کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔

میں رک جاتا ہوں میری سانس پھولی ہے لیکن وہ ایسے ہے جیسے سانس سے عاری ہو اور پھر میں اس کے بدن کو چھوتا ہوں تو سردی کی لہر جیسے کیل کی طرح میرے اعصاب میں گڑ جاتی ہے۔

میں جب واپس مڑتا ہوں تو میرے جسم کی مانند اس کے جسم کو بھی علم ہے کہ اب میں کبھی دوبارہ نہ لوٹوں گا۔

O.....O.....O

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

بچھو

بڑی سے بڑی تیز طرار اور پرکشش عورت بھی اپنے عمل سے مجھے محبت کے رشتہ کی دیرپائی کا قائل نہ کر سکی جب کہ ایک مرد نے' جو اتفاق سے میرا دوست بھی تھا' نفرت کی تلخی کی شدت مجھ پر آشکار کر دی اور یہ میں تسلیم کر رہا ہوں۔ میں! جس نے تمام عمر مردوں کو سونگھنے اور عورتوں کے پرکھنے میں صرف کی ہے۔ مجھے آج تک کوئی عورت مستقلاً اپنا نہ بنا پائی ان کے ملنے جلنے اور سب کچھ نچھاور کرنے کے باوجود بھی جواباً میں انہیں کپڑے لتے اور گہنے ہی دے پاتا جب کہ اس کے برعکس میں اپنے دوست سے نفرت کی جس ڈور میں بندھا تھا' وقت اس کے بندھنوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا گیا۔ اس حد تک کہ اب میں نفرت کے قفس کا اسیر ہو چکا ہوں۔

میں نے سامنے بیٹھی عورت کو...... جو اتفاق سے میری ناکام محبت اور حسن اتفاق سے اس کی بیوی تھی' نظر بھر کر دیکھا تو ٹھنڈی چائے کو کپ میں ابلتے محسوس کیا۔ اس نے میری نظروں کو اپنے چہرہ پر مرکوز پایا تو گھبرا کر روایتی انداز میں آنکھیں نہ جھکائیں اور رومانی افسانہ نگاروں کی پسندیدہ منظر نگاری کی مانند نہ ہی اس کی جھیل جیسی گہری اور نیلی آنکھوں پر پلکوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہ ہوئی بلکہ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب پرتوقع انداز میں مجھے دیکھا۔ وہ آنکھیں نہ تھیں ترازو کے پلڑے تھے جن میں' میں نے خود کو تلتے محسوس کیا۔ یونیورسٹی کی پتلی دبلی بے حد سنجیدہ اور اسی لئے باوقار دکھائی دینے والی لڑکی بیوی بن کر عجب طلسمی سانچہ میں ڈھلی تھی'

استری پھرا جسم پھلواری میں تبدیل ہوا وہ پر بہار بلکہ سدا بہار نظر آ رہی تھی۔ اس نے نظر کے پرندے کو جوڈال ڈال پات پات پھدکتے دیکھا تو اسے اڑانے کے بجائے جن نظروں سے دیکھا وہ اس انشورنس ایجنٹ کی تھیں جو متذبذب گاہک کو بھاری مالیت کی بیمہ پالیسی فروخت کرنے کا تہیہ کئے بیٹھا ہو۔

ہماری نظروں کے ملنے سے جو سپارک پیدا ہو رہا تھا تعجب ہے کہ اس سے بجلی کا فیوز کیوں نہ اڑ گیا۔

یقیناً یہ عورت بھی اس سے نفرت کی ایک بڑی اہم وجہ تھی مگر مرکزِ نفرت حسب عادت مسلسل بول کر حسب فطرت شام غیبت منا رہا تھا۔ بجو جیسے لمبوترے منہ باہر نکلے دو پیلے دانتوں اور چھوٹی چھوٹی گول کمینی آنکھوں کے مجموعی تاثر سے کراہت کا احساس ہوتا تھا۔ اس احساس میں جب اس کی جھینگر جیسی سمع خراش آواز بھی شامل کر لی جائے تو یہ کراہت اعصاب شکن بن جاتی۔ بے حد پتلے غیر مردانہ زرد لبوں پر اس کی چھپکلی جیسی لمبی زبان مسلسل پھرتی رہتی' زبان سے ہونٹ تر ہوتے تو زردی چمک کر مردہ مینڈک کے پیٹ جیسی رنگت اختیار کر جاتی۔ اس نے دوستوں کو اتنا آزار پہنچایا تھا کہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون زہر بن گیا اور اتنی غیبت کی تھی' اتنا برا کہا تھا اور اتنے جھوٹ بولے تھے کہ سات بل کھا کر اس کی زبان بچھو کے ڈنگ میں تبدیل ہو گئی۔ اسی لئے دوستوں کے حلقے میں پیار سے اسے بچھو کہا جاتا تھا۔ شاید اسے بچھو کے نام کا علم نہ ہو لیکن اگر تھا تو اس کا اظہار نہ کیا تھا وہ اتنا پکا بچھو تھا کہ وہ ہمیں ناراضگی کی تسکین دینے کو بھی تیار نہ تھا۔

میں عام لوگوں کے برعکس آستین میں سانپ کے بجائے بچھو بھی پال سکتا ہوں اس لئے میری اس سے بڑی گہری دوستی تھی لیکن اس کے ساتھ اس سے شاید نفرت بھی تھی شاید اس لئے کہ زہر بھرے دانت توڑ کر سانپ کو سپیرے میں تبدیل کر کے بین پر نچایا بھی جا سکتا ہے لیکن بچھو کو کون سدھائے! اپنے زہر کی جوالا میں مست رہنے والے بچھو کو کون نچائے!

اس نے ہمارے ایک مشترک دوست کی شریف بیوی کے بارے میں ایک گھٹیا بات کو اس پر لطف اسلوب میں بیان کیا کہ اس کے قہقہہ میں شریک ہو کر میں نے اس کے

بڑھے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ میرے کھلے منہ سے قہقہے ابل رہے تھے جب کہ نفرت کی لہروں سے اعصاب میں جوار بھاٹا تھا۔

میز سے اٹھتے وقت جسم کی پھلواری کوکی' توڈال ڈال میں پات پات! آج کی شام کا میرے لئے صرف یہی پہلو خوشگوار تھا کہ بل بچھو نے ادا کیا تھا۔ بچھو جس طرح ڈنگ مارنے میں بے تکلف تھا اس طرح خرچ کرنے میں بھی...... اب یہ الگ بات ہے کہ اس کا پیسہ بالعموم ہضم نہ ہوتا۔

تازہ جوان لڑکا اس بچھڑے کی مانند ہوتا ہے جس کا ہر وقت کلیل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ بچھڑا تو واقعی ہر وقت اور ہر جگہ کلیل کرسکتا ہے لیکن نوجوان نہیں۔ کم از کم میں تو خود کو ایسا ہی نوجوان محسوس کر رہا تھا جسے کلیل کرنے کیلئے کسی طرح کی بھی سہولت حاصل نہ تھی۔ ادھر عالم یہ تھا کہ کالج میں دو برس بسر کرنے کے باوجود میں ابھی تک فرسٹ ایئر فول ہی تھا لڑکیوں سے آنکھیں چار کرنی تو کجا میں تو سینئر لڑکوں سے بھی آنکھ ملا کر بات نہ کر پاتا۔ ان حالات میں کہ کلیلوں نے معدہ میں کھلبلی مچا رکھی تھی مجھے بچھو نے مشورہ دیا۔

''تم سگریٹ پیا کرو۔''

وہ میرے ساتھ ڈیسک پر بیٹھتا تھا۔ ابھی اس کے جوہر نہ کھلے تھے اس لئے وہ میرا رازدار بھی تھا۔

''سگریٹ! کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہاں ہاں بڑا مزہ آتا ہے۔''

''تم نے پی ہے!''

''نہیں' میں نے تو نہیں پی۔''

''تو پھر کیسے کہتے ہو۔''

''سب یہی کہتے ہیں۔'' مجھے متذبذب دیکھ کر وہ بولا ''اس سے غم غلط ہوتا ہے۔ خیالات بلند پرواز ہو جاتے ہیں اور......''

''یار! جوتے پڑیں گے۔''

''جوتے کیسے؟ گھر والوں کو خبر نہ ہونے دو تو انہیں کیسے معلوم ہوگا۔''

''اور کالج؟''

ان دنوں ہم طلبہ کی انجمنیں آج کی مانند طاقت ور نہ تھیں' اس لئے ہم طلباء اپنے پروفیسروں کا ادب کرتے تھے اور پرنسپل صاحب کو ان کے کمرہ میں بند کر دینے کے برعکس ان کے کمرے میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

''اوہ! کالج کا کیا ہے۔'' وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولا خیر! میں نے سگریٹ نوشی کی مہم کا آغاز یوں کیا کہ جو سودا سلف لاتا اس میں سے کچھ پیسے کاٹ لیتا تین چار دن کی کتر بیونت کے بعد میں ایک پیکٹ اور ماچس خریدنے کے قابل ہو گیا۔ ہم نے انگریزی کا پیریڈ گول کیا اور کالج کے ایک دور افتادہ اور اسی لئے نسبتاً غیر آباد گوشے میں جا دبکے۔ اناڑی پن سے پہلا سگریٹ سلگایا تو عجیب اعصابی مسرت کا احساس ہوا' بہر حال کھانستے کھانستے ہم سگریٹ نوشی کے راستہ پر چل نکلے۔ ہمارا غم تو کیا غلط ہوتا الٹا سگریٹ کے لئے پیسے جمع کرنے کے مسئلہ کا آغاز ہو گیا۔ اس کے گھر کے حالات اچھے نہ تھے وقتاً فوقتاً باپ ٹھکائی کرتا رہتا' ان حالات میں کہ تعلیم لشتم پشتم چل رہی تھی اس سے سگریٹ نوشی کے لئے پیسوں کی توقع بے کار تھی چنانچہ میں ہی سگریٹوں کا بندوبست کیا کرتا البتہ اس کی لچھے دار باتیں مزہ دے جاتیں۔ اس نے سب پروفیسروں اور بعض ساتھی طالب علموں کے مزے دار نام رکھ چھوڑے تھے وہ ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سناتا جو جھوٹ کا پلندا ہونے کے باوجود بھی مزے دار لگتیں' میں ان دنوں شرمیلا اور خاصا کم گو تھا اس لئے اس کی لچھے دار باتوں اور لچھے دار اسکینڈلوں میں بڑا مزہ ملتا اور یوں سگریٹ کے کش اور بھی پر لطف بن جاتے۔

اور پھر ایک دن۔

وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور اس کا انتظار کرتے کرتے میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ بازوؤں کا تکیہ بنائے اور ہونٹوں میں سگریٹ دبائے میں سردیوں کی چمک دار دھوپ میں نیلے آسمان میں گم تھا کہ اچانک آواز آئی۔

''یو! یو ویرَ!''

مجھے آسمان سے زمین پر اترنے میں خاصا وقت لگا اور جب میں بالآخر زمین پر

اترا تو خشمگیں آنکھوں سے گھورتے پروفیسر کو دیکھ کر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کالج سے ایکسپلی ہوتے ہوتے بچا۔ بہت بے عزتی ہوئی۔ یہ اس کا پہلا ڈنگ تھا مگر آخری نہیں۔

ہماری دوستی اس بنا پر عجیب تھی کہ اس کی کمینگیوں کے باوجود میں اس کا کچھ ایسا عادی سا ہو چکا تھا کہ اسے چھوڑ بھی نہ سکتا تھا۔ بعض اوقات مجھے اس پر ترس بھی آتا کہ اس کے حالات واقعی بہت خراب تھے۔ نہ جانے اس کے باپ کو یہ کیسے شک ہو گیا کہ وہ اس کا نہیں ہے حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ میں کئی مرتبہ ان کے گھر گیا تھا' اس کی ماں بہت اچھی اور شفیق خاتون تھی۔ دراصل باپ خود بدکار تھا اس لئے شریف بیوی کو کسی نہ کسی طرح سے پریشان کرتا رہتا تھا۔ اسے گھر سے جیب خرچ نہ ملتا ادھر میں غریب گھر کا ہونے کے باوجود اس کے مقابلے میں خاصا خوشحال تھا لہٰذا میں اس کی ضرورت تھا ادھر مجھے بھی اس کی بس بھری مگر بارہ مصالحہ کی چاٹ جیسی باتوں کی لت تھی اور یوں ہم دونوں تھری لیگڈ ریس کے پارٹنر کی مانند لازم و ملزوم تھے۔ شاید وہ نارمل تھا اور میں ہی ابنارمل تھا کہ اسے چھوڑ نہ سکتا تھا۔ میں عادات' مزاج' اطوار' خیالات' نظریات ہر لحاظ سے اس کے برعکس تھا شاید میری فطرت کے امرت میں کچھ بوندیں زہر کی بھی تھیں جو اس کی زہر بھری فطرت سے ہی مطمئن ہو سکتی تھی۔ لڑتے' جھگڑتے اس سے نقصان اٹھاتے اور اسے نقصان پہنچانے کے ناکام منصوبے بناتے' ہم نے کالج کے چار برس پورے کیے اور یونیورسٹی آ گئے جہاں وہ بھی تھی۔ پتلی دبلی' بے حد سنجیدہ اور اسی لئے باوقار دکھائی دینے والی لڑکی۔

اور اب جب کہ (کم از کم میری حد تک) پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا تک اچانک پچھو سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا میرا مطلب ہے زبان سے ڈنک سے لگاتے' وہ بے حد دولت مند تھا اور اس خزانہ کا سانپ' میرا مطلب میں جسے حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ یہ سب مجھے جلانے کو کافی تھا لیکن ایک بات ایسی تھی کہ حسد کی آگ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑ گئے اور وہ تھی اس کی بیوی کی گھر سے باہر کی سرگرمیاں ان سرگرمیوں کے ہزار رنگ تھے مگر سرگرمی ایک ہی تھی۔ وہ میرے مقابلہ میں عملی زندگی میں بے حد کامیاب تھا۔ دولت اور اثر رسوخ کی کمی نہ تھی زبان کا ڈنک بھی سدابہار تھا لیکن ان سب کے باوجود ایک محاذ پر شکست کھا گیا۔ وہ تمام باتیں سن سن کر

میں خوش ہوتا رہا اور سوچتا بھی رہا۔

اور پھر ایک دن...... نہ جانے کیا کچھ سوچ کر میں نے فون کیا۔ ''ہیلو'' میرا نام سنتے ہی لہجہ کی بے زاری چہچہاہٹ میں تبدیل ہوگئی ''کہاں رہے اتنے دن!''

میں نے مختصر ترین الفاظ میں گزشتہ ایام کی سرگرمیوں کا خلاصہ گوش گزار کیا۔ وہ سن کر ہنس دی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ بے حد بور زندگی گزار رہے ہو۔''

''بھئی! جب تم لفٹ نہ کراؤ گی تو زندگی تو بور ہی گزرے گی۔''

میں تذبذب کے عالم میں سانس روکے تھا یا تو وہ غصہ سے فون بند کر دے گی اور گنگا سوکھی نکلے گی ورنہ...... اس ایک لمحہ کا سسپنس تناؤ میں صدیوں تک پھیل گیا وہ بھی جیسے سانس روکے تھی۔ شاید وہ میری رکی سانس کے اعصابی تموج کا اندازہ لگا رہی تھی اور پھر اس کے قہقہے نے منجمد برف تڑاخ سے توڑ دی۔

''یوڈرٹی......''

''......اولڈ اینڈ بیچرس۔'' میں نے ہنس کر فقرہ مکمل کر دیا' اس نے ایک خاص ہوٹل میں' ایک خاص نمبر کے کمرہ میں ایک خاص وقت پر' رات کے کھانے کے لئے مدعو کیا

''مگر ایک شرط ہے'' وہ ہنس کر بولی۔

''کیا''

''بل تم پے کرو گی۔''

''اوکے۔''

میں اس کوہ پیما کی مانند پر جوش تھا جو بیس کیمپ سے کے۔ٹو کا اس عزم کے ساتھ نظارہ کرتا ہے کہ اب یہ چوٹی سر ہوئی۔ میں نے نہ صرف گزشتہ برسوں کی رومانی حماقت کا حساب چکانا تھا بلکہ اریرز بھی کلیئر کرنا تھا اور اس لئے میں خوش تھا' بے حد خوش!

میں دولہا بنا تیار ہو رہا تھا کہ سیٹی بجاتے ہونٹ اچانک ساکت ہو گئے۔ ہونٹ کیا میرا سارا جسم ہی ساکت تھا ارے! ارے یہ بات پہلے کیوں نہ سوجھی! میں نے تصور میں تمام منظر کا جائزہ لیا تو امکانی ردعمل کا تصور بے حد لذیذ تھا۔ میں نے خوشی سے لرزتی انگلیوں سے بچھو کا نمبر ڈائل کیا اور اسے ایک خاص ہوٹل میں ایک خاص نمبر کے کمرہ میں ایک خاص

وقت پر رات کے کھانے پر مدعو کیا۔

''کیا سلسلہ ہے؟''

''سلسلہ بے حد دلچسپ ہے بلکہ بھابھی کو بھی لیتے آنا۔''

''وہ تو اپنی کسی سہیلی کی شادی میں جارہی ہے شاید رات وہیں گزارے۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ بہر حال تم ضرور آنا۔''

''آؤں گا۔ مگر کیا چکر ہے کوئی فلم ولم تو نہیں؟''

اسے ایک خاص رنگ کی فلمیں بہت پسند تھیں۔

''ہاں ہاں فلم ہی سمجھ لو۔ ایسی فلم کہ اگلی پچھلی تمام فلمیں بھول جاؤ گے۔'' میں نے فون کے باوجود اس کی رال ٹپکتی محسوس کی۔

''آؤ گے نا؟''

''ضرور!''

''پابندیٔ وقت ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

O.....O.....O

بکری

نیچے گلی میں سے بکری کی درد میں کربناک آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ بڑی سی تھالی میں چاولوں میں دائرے بناتے اس کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اس کا بھی گلی کی دیگر عورتوں کی مانند نیچے جھانکنے کو دل چاہا۔ گو گلی میں جھانکنے والی عورتیں اسے نظر نہ آ رہی تھیں لیکن وہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی کہ اس وقت گلی کی تمام عورتیں اپنے دروازوں، کھڑکیوں اور کوٹھوں سے جھانک رہی ہوں گی۔ شادی کے کھونٹے سے بندھی بکریوں کی مانند ان عورتوں کی دلچسپیاں اور زندگیاں خانگی حالات کی زنجیر کے دائرہ کے اندر محبوس تھیں۔ تواتر سے بچے پیدا کرنے والیوں کے لئے آج ایک اچھا خاصا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔

گلی میں بکری وضع حمل کے درد سے چلا رہی تھی۔

سبھی جانتی تھیں کہ بیگاں کی بکری آج کل ہی میں ''سونے'' والی ہے۔ اس لئے اس کی پہلی آواز ہی پر زرینہ چاولوں کی تھالی رکھ کر کھڑکی کی طرف بھاگی تھی۔ مگر ساس کی کسی بکری جیسی کرخت اور کھردری آواز اس کے پاؤں میں گویا کانٹے کی طرح چبھی......

''کہاں بھاگی جا رہی ہو؟''

''وہ......وہ......''

بکری دوبارہ چلائی اور اس نے کھٹ کھٹ کر کے دروازوں اور کھڑکیوں کے کھلنے اور ان کے ساتھ ہی کسی ریوڑ کی مانند عورتوں کی بھنبھناتی آوازیں سنیں۔ بکری کا درد اسے اپنے پیٹ سے نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔

''وہ بکری......'' وہ بالآخر بولی۔

''تو کیا؟''

زرینہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی ساس کے بھدے اور بدرنگ ہونٹوں سے نکلے ان الفاظ نے چھری بن کر کسی بکری کی مانند اسے ذبح کر دیا۔ اس نے ساس کی طرف ویسی ہی بے چارگی سے دیکھا جیسے ذبح ہوتے وقت بکری قصاب کو دیکھتی ہے۔ وہ بددلی سے آ کر بیٹھ گئی۔ گو اس کے ہاتھ اب بھی چاولوں سے کنکر چن رہے تھے مگر کان بکری کی درد میں ڈوبی آوازوں کی طرف لگے اور ذہن ان تمام مناظر کو تصورات میں لا رہا تھا۔ اس نے تخت پوش پر جلدی جلدی تسبیح پھیرتی ساس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور نیچے کو لٹکتا جبڑا اور آگے کو بڑھی ہوئی ٹھوڑی اسے بکری سے مشابہہ کر رہی تھی۔ آدھی کھلی آنکھیں اور مسلسل ہلتے ہونٹ دیکھ کر زرینہ کو دھوپ میں بیٹھی جگالی کرتی بکری یاد آ گئی۔

بکری اب بھی تکلیف سے چلا رہی تھی۔ زرینہ نے سوچا ہائے اللہ! کتنی تکلیف ہوتی ہو گی، پھر اس نے بکری کی تکلیف آسان ہو جانے کے لئے دعا مانگی۔ یا مولا علی مشکل کشا! اس بے زبان کی تکلیف میں کمی کر دے۔

بکری ایک لمحہ کو خاموش رہی زرینہ خوش سی ہو گئی۔

ہاتھ چاولوں سے کھیل رہے تھے اور ذہن بکری، اس کے گرد کھڑے بچوں اور گودوں میں بچے لئے دروازوں سے لگی عورتوں کو دیکھنے کی سعی میں مصروف تھا۔ نیچے گلی سے کسی بچہ کے رونے کی آواز بلند ہوئی لیکن وہ بکری کا نوزائیدہ بچہ نہ تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں۔ سامنے تخت پوش پر بیٹھی بھدی سی بکری ابھی تک آنکھیں بند کئے جگالی میں مصروف تھی۔

بکری اس مرتبہ بہت زور سے چلائی۔

زرینہ بکری کی تکلیف سے بے چین ہو گئی۔ زرینہ کو جانوروں سے کسی قسم کی بھی دلچسپی نہ تھی بلکہ اسے تو وقت بے وقت بکری کا بولنا بھی برا ہی لگتا۔ بیگاں کا دروازہ بالمقابل تھا۔ اس لئے بعض اوقات تو اس کا شور ناقابل برداشت ہو جاتا تھا۔ زنجیر کھلی رہ جاتی تو وہ ان کے صحن میں گھس کر گندگی پھیلا جاتی۔ ایسے میں تو وہ اسے اور بھی بری لگتی اور ایک مرتبہ تو

اس نے جل کر اسے خوب ہی چمٹوں سے پیٹا تھا۔ لیکن جب سے بکری کا پیٹ پھولنے لگا تھا زرینہ اس کے لئے ایک عجیب قسم کی عزت سی محسوس کرتے ہوئے اس کی حالت پر رشک کرنے لگی تھی۔ وہ خود کو بکری سے اس بنا پر بدرجہا کمتر محسوس کرتی تھی کہ پانچ سالہ ازدواجی زندگی، خاوند کی سرتوڑ کوششوں، ماں کے تعویذوں اور ساس کے طعنوں کے باوجود بھی وہ حاملہ نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے وہ بکری کے حمل سے بہت زیادہ دلچسپی لیتی رہی۔ سبزی کے پتے اور بچی ہوئی سوکھی روٹیاں اسے کھلاتی رہتی، کبھی کبھار وہ پیار سے اس کی پیٹھ سہلاتی تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں ایسے میں وہ یہ محسوس کرتی گویا بکری اس کا دکھ سمجھتی ہے۔ بکری سے آنکھیں چار ہونے پر یہ احساس ہوتا گویا بکری اسے اپنی حالت پر نہ کڑھنے کا مشورہ دے رہی ہو۔

اس مرتبہ تو بکری بہت ہی بری طرح چلائی۔

اس کے خیالات گویا رسی تڑا کر نکل بھاگے۔

گلی میں بابو! بابو! کے نام کی پکار سے اسے معلوم ہوا کہ بابو کو بلوایا گیا ہے۔ پہاڑی بکرے ایسی پلی ہوئی گردن اور جسم سے پسینہ اور دودھ کی ملی جلی بو اس کی سب سے بڑی خصوصیات میں سمجھی جا سکتی ہیں۔ لوگ تو دودھ میں پانی ملاتے ہیں وہ پانی میں دودھ ملا کر بیچنے والوں میں سے تھا۔ بہر حال اسے ''ایسے'' کاموں کی بہت سمجھ تھی۔ جب دائی خود کو لاچار محسوس کرے تو لیڈی ڈاکٹر بلواتے ہیں اسی طرح بابو بھی خاص اور پیچیدہ ''کیس'' میں بلوایا جاتا تھا۔

اللہ میرے! زرینہ نے سوچا کتنی شدید تکلیف ہوگی۔ جب جانور کا یہ حال ہے تو...... اس کی نظریں اپنی ساس پر مرکوز ہو گئیں جو پون درجن بچے پیدا کرنے کے بعد...... بکری بن چکی تھی اور جس سے خاوند اور آدھی درجن بچوں کی موت نے بکری والی نرمی اور حلیمی چھین لی تھی۔ دو بیٹوں نے شادی کے بعد اپنے اپنے گھر بسا لئے تھے اور اب وہ زرینہ کے حق میں ناگن بنی اپنے بیٹے کی حفاظت کر رہی تھی۔

بکری کے درد سے زرینہ کو یاد آیا کہ ایک مرتبہ پیٹ کے شدید درد سے اس کی چیخیں نکل نکل گئی تھیں۔

اور وہ اس درد کے تصور میں ڈوب گئی۔

درد.....درد.....اس نے سوچا.....

بکری پھر چلائی!

زرینہ کو درد سے چلاتی بکری پر رشک آرہا تھا۔ وہ تخلیق کے کرب میں مبتلا تھی اور ایک نئے وجود کی تخلیق سے اپنے وجود کا مقصد پورا کر دے گی مگر وہ.....وہ تو کچھ بھی نہ کر سکی۔ اسکی ساس اب ہر وقت بیٹے کے کان بھرتی ہے۔ وہ طلاق دلوا کر اولاد کے لئے نئی بہو لانے کی فکر میں ہے کیا پتہ کل کو وہ کامیاب ہو ہی جائے اور یوں زرینہ طلاق لے کر اپنے گھر دودھ نہ دینے والی بکری کی مانند بے مصرف اور غیر اہم زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ وہ نماز کے بعد رو رو کر دعائیں مانگ چکی تھی مگر کوئی دعا کارگر نہ ہو سکی۔ وہ سوچ رہی تھی اے کاش! اس بکری کی طرح میں بھی درد سے چلا رہی ہوتی۔ آنکھوں میں بکری کا تصور اور کانوں میں اس کی آوازیں لئے اس سے چاول نہ چنے جا رہے تھے۔ ساس نے اپنا وظیفہ ختم کر لیا تھا اور وہ تخت پوش پر سے مصلہ لپیٹ رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر اس مرتبہ تو بکری اس شدت سے چلائی کہ وہ دروازہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

......بکری مسلسل چلائے جا رہی تھی!

اور پھر گلی میں بچوں کے شور اور عورتوں کی پرجوش آوازوں سے وہ سمجھ گئی کہ بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ نہ جانے کیا ہوا ہے؟

زرینہ نے بے بسی سے سوچا اس نے اپنی ساس کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں چار ہونے پہ زرینہ نے جلدی جلدی چاول صاف کرنے شروع کر دیئے۔ ساس کی نظریں گویا طعنہ دے رہی تھیں تم سے تو یہ بکری ہی اچھی ہے۔

بکری نے دوبارہ چلانا شروع کر دیا تو زرینہ نے اندازہ لگایا اب دوسرا بچہ پیدا ہوگا۔ وہ تصور میں بکری کی آنکھوں میں اطمینان، فخر اور ممتا کے ملے جلے جذبات کی چمک دیکھ رہی تھی۔ ساس اب باورچی خانہ میں جا کر آگ جلانے لگی تھی۔ یہ کیسی عورت ہے؟ زرینہ نے جل کر سوچا نہ تو اسے خود ایسی باتوں سے دلچسپی ہے اور نہ ہی وہ اسے دیکھنے دیتی ہے۔

کان پھر بکری کے چلانے پر لگے تھے۔ جلد ہی بچوں کا شور بلند ہونے سے وہ یہ سمجھ گئی کہ دوسرا بھی ہو گیا ہے۔ اس کے بعد بکری ایک آدھ مرتبہ پھر بولی مگر اب اس کی آواز میں نقاہت تو تھی لیکن درد کی لرزش نہ تھی' اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی۔ زرینہ یہ جاننے کے لئے' بے چین تھی کہ وہ ''چھیلے'' ہیں کہ ''چھیلیاں''۔ گلی میں سے بچوں اور عورتوں کی باتوں کا ملا جلا شور سا بلند ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

بیگاں بھاگی بھاگی آئی' اس کا چہرہ' خوشی اور شدت جذبات سے یوں سرخ ہو رہا تھا گویا بکری اس کی بیٹی یا بہو ہو۔

''بہن مبارک! چھیلیاں نے چھیلیاں!''

وہ صحن میں کھڑی ہو کر چلائی اور زرینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اتنے میں زرینہ کا خاوند باہر سے کھانا کھانے آ گیا۔ اس کی ساس بیٹے کو دیکھ کر بیگاں اور بکری کو بھول گئی اور باورچی خانہ سے چلائی۔

''زرینہ''

''جی!''

''امجد آ گیا ہے اسے کھانا دے دو۔''

''اچھا جی!''

''میں سالن گرم کر رہی ہوں آ کر لے جانا۔''

''جی اچھا جی!''

اور جب وہ کھانا لئے خاوند کے کمرے میں داخل ہوئی تو کمرہ کے ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں قصائی کی دکان پر رکھی 'سری' سے مشابہ بے نور اور مکروہ آنکھوں سے چار ہوئیں تو اس نے سوچا اے کاش میں بکری ہی ہوتی اور اس نے کھانے کو گھاس کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

○.....○.....○

نقلی چوکیدار

اذان کے ساتھ ہی آنکھ کھل گئی لیکن آنکھیں بند کئے لیٹا رہا کہ رات دیر تک جاگا تھا۔ گھر میں بھانت بھانت کے مہمان اوپر سے شادی کی تمام مصروفیات' سارے دن کی بھاگ دوڑ' یہ کرو وہ کرو' کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن خود کیے بنا چین کہاں؟ آدھی رات تک ڈھولک یوں پٹی جیسے تھانے دار کے ہاتھوں مجرم کی گت بن رہی ہو! اوپر سے طرح طرح کی بے سری آوازیں۔ یہ سب برداشت کیا جا سکتا تھا کہ موقع خوشی کا تھا لیکن رشتہ داری کے کاروبار تو اس کے بس کا روگ نہ تھے' یہ بیوی کا دل گردہ تھا کہ ایک ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آ رہی تھی اور اس سے بھی مشکل یہ کام کہ باتیں سن کر ان سنی کر رہی تھی کہ بیٹی کی خوشی تھی۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور بیوی کی طرف دیکھا جو سارے دن کی تھکن سے چور بے ہوشی کی نیند میں تھی۔ کمرے سے نکلا تو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اب نماز پڑھنے کے علاوہ کیا کرے۔ یوں ہی بلا مقصد کمرے جھانکنے لگا۔ سب میں ٹھنسے ٹھنسائے مہمان یوں بے ترتیب سو رہے تھے جیسے سٹور میں بے کار چیزیں پڑی ہوں!

اس کی ماں بیٹھی وضو کر رہی تھی' اس نے اسے آہستگی سے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا' بیٹی کے کمرہ میں پہنچا تو جوان لڑکیوں کے جھرمٹ میں وہ ستارہ سی دمک رہی تھی' کونے میں ڈھولک سکون کی سانس لیتی محسوس ہو رہی تھی وہ سب دری پر ہی سو گئی تھیں۔ اس نے بیٹی کو نماز کے لئے جگانا چاہا پھر سوچا آج سو لینے دو بے چاری کو' باپ کے گھر یہ

آخری رات ہے۔

وہ سوتی بیٹی کو دیکھتا رہا! کم بخت اچانک ہی کتنی بڑی ہوگئی تھی' وہ کہ کونپل تھی اور پھر کلی لیکن پھول بننے سے پہلے ہی اچانک بیری میں کیوں تبدیل ہوگئی' وہ لڑکی جو جانگیہ پہنے تلاتی تلاتی صحن میں بھاگی پھرتی تھی اچانک ایسی کیوں بن گئی کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے سے ڈر آنے لگا۔ وہ اب بھی سوتی بیٹی کو آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکا' خاموشی سے باہر نکل آیا۔

بیوی جو جاگ چکی تھی اب باورچی خانہ میں چائے کے لئے پانی ابال رہی تھی۔

''کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔''

وہ اسے دیکھے جا رہی تھی وہ چور سا بن کر بولا۔ ''یونہی نجمہ کو دیکھنے گیا تھا۔''

''ابھی تک جاگی نہیں؟''

''نہیں۔''

''تو جگا دیتے۔ لمبی چوڑی تیاری کرنی ہوگی۔''

''ہاں! سوچا تو یہی تھا مگر دل نہ مانا۔''

بیوی خاموش رہی' وہ پھر بولا۔ ''کیسی عجیب عجیب سی لگ رہی ہے؟''

وہ بھنویں سکیڑ کر بولی ''عجیب عجیب سی کا کیا مطلب؟''

''پتہ نہیں کیا مطلب ہے؟'' اس نے خاموشی سے چائے کا کپ اپنی طرف سرکایا ایک گھونٹ لیا تو ہونٹ جل گئے مگر اس نے بے خیالی سے کپ رکھ دیا ''کیسی عجیب بات ہے کہ دن ختم ہونے سے پہلے ہمارا اس پر کوئی حق نہ رہے گا!''

''تم تو سنک رہے ہو صبح صبح!'' بیوی تنک کر بولی۔ ''شکر نہیں کرتے کہ ایسا اچھا رشتہ مل گیا ہے' عیش کرے گی عیش! نہ ساس نہ نند' بھائی اپنے اپنے گھر کے' ایک بوڑھا باپ ہے بس! راج کرے گی راج!''

''نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔''

''میں ساری زندگی تمہارے مطلب سمجھی ہوں جواب سمجھوں گی۔''

اس نے جواب نہ دیا اور خاموشی سے نظریں جھکائے چائے پیتا رہا۔ وہ اسے دیکھتی ہے۔ کھچڑی بالوں کے باوجود اس وقت وہ کسی بچہ کی طرح الجھا الجھا سا نظر آ رہا تھا' اس وقت اسے غصہ کے ساتھ ساتھ اس پر پیار بھی آ رہا تھا۔ وہ سدا کا سیدھا تھا۔ اس کے مقابلہ میں وہ خود کو بہت چالاک سمجھتی تھی شاید اسی لئے خاوند سے اس کی محبت میں عجیب طرح کی مامتا بھی شامل ہو چکی تھی' اس نے اسے پھر دیکھا اس کی موٹی موٹی آنکھوں پر لمبی پلکیں جھکی تھیں۔ وہ اب بھی خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ بڑھتی عمر صرف اس کے بالوں کو چھو سکی تھی چہرے کے نقوش پر اب بھی وہی بھولپن باقی تھا جس کی عدم موجودگی کی بنا پر اکثر مرد خوبصورت نظر نہیں آتے۔

''جاؤ نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' اب بیوی بولی تو اس کی آواز میں عجیب لہر نے موج ماری حالانکہ مدت سے وہ پیار کی لہر کے مقابلہ میں ریتلا ساحل بن چکی تھی۔ وہ بہت خوش قسمت ہے کہ محبت کرنے والا ایسا پیارا خاوند ملا اور تو اور اس نے کبھی یہ بھی نہ جتایا کہ تم صرف ایک ہی بیٹی پیدا کر کے بس ہو گئی ہو! حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ خاوند میں نہیں اس میں خامی تھی۔

گھر کے اکثر لوگ بیدار ہو چکے تھے اور اب تک کا خاموش گھر بچوں کے رونے' عورتوں کے بولنے' کھانسنے' تھوکنے' ڈکارنے سے گونج رہا تھا۔ منہ دھل رہے تھے' کلیاں ہو رہی تھیں' فلش کی زنجیریں کھنچ رہی تھیں' چائے' بند' ڈبل روٹی' مکھن' انڈے بھی ناشتے میں جتے تھے۔

''میاں صاحب سب سامان تیار ہے۔'' دیگیں پکانے والا نائی آ چکا تھا۔

''ہاں بھئی۔''

اس کا شاگرد ریڑھے پر سے دیگیں اتروا رہا تھا' تین تین اینٹیں کھڑی کر کے چولہے بنا دیئے گئے' نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں اوپر دیگیں ابل رہی تھیں۔ وہ کرسی بچھائے اخبار ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا' لیکن نہ اخبار پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا اور نہ کچھ اور کرنے کو' یوں ہی خاموش بیٹھا دیگوں کو گھورتا رہا۔ پھر یوں ہی بول اٹھا۔

''خلیفہ جی! کھانا فرسٹ کلاس ہونا چاہیے۔''

خلیفہ جس نے اپنی شادی کے علاوہ اس علاقہ کی ہر شادی پر دیگیں اتاری تھیں اس بے تکی بات کا جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اس نے بھی یہ بات خلیفہ کی بجائے غالباً اخبار سے کہی تھی اس لئے جواب نہ ملنے پر کوئی تعجب نہ تھا۔

سامنے گھر کے خالی پلاٹ میں شامیانہ لگایا جا چکا تھا۔ وہ اٹھا اور کرسیاں لگتی دیکھتا رہا۔ دولہا کے لئے الگ مسند بنائی گئی تھی' سرخ قالین پر سرخ پلش کے غلافوں والے گاؤ تکیے دھرے تھے۔ خاص مہمانوں کے لئے صوفے تھے' چمکیلی دھوپ میں شامیانہ کے رنگ چمک رہے تھے' تکیے اور قالین چمک رہے تھے۔ وہ خاموشی سے مسند پر بیٹھا کام کرنے والوں کو دیکھتا رہا۔ کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ کھانے کے لئے میزیں ٹھیک کی جا رہی تھیں۔ یہ سب گھر کے نوجوان لڑکے تھے خوب زور زور سے باتیں کر رہے تھے' ہنس رہے تھے اور پھرتی سے کام کیے جا رہے تھے۔

''انکل ٹھیک ہے؟''

ان میں سے ایک نے آواز دے کر پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔'' وہ بے خیالی سے بولا۔

لڑکے اس کے قریب آ کر بولے ''اٹھیے یہاں صفائی کرنی ہے۔''

وہ دولہا کی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن گرد کے اٹھتے غبار میں زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ کھانستا باہر آ گیا۔

شادی والے دن ہر طرح کا مرد خوبصورت بن جاتا ہے لیکن یہ دولہا تو بس یوں ہی سا تھا۔ رنگ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ کالا نظر آ رہا تھا' ہونٹ بھی کچھ موٹے ہی سے تھے' اس کے ہاتھ بھی کاریگروں کی طرح چوڑے چوڑے اور کھردرے سے لگے۔ اس کے جسم میں جھرجھری کی لہر دوڑ گئی۔

دولہا کا دوست سہرا پڑھ رہا تھا۔ جس کی ایک ہی خصوصیت سمجھ میں آئی کہ دولہا کے تمام خاندان کے نام اس میں آ گئے تھے۔ وہ شاعر نہ تھا لیکن اسے یقین تھا کہ اشعار وزن سے گرے ہوئے تھے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ......'' مولوی صاحب کی مرغن حلق سے الفاظ جیسے گھی میں

تر ہو کر پھسلے جا رہے تھے۔ سر ہلنے کے باوجود ڈاڑھی نہیں ہل رہی تھی کمال ہے!

''قبول ہے! قبول ہے!! قبول ہے!!!''

''مبارک!''

''مبارکاں!!''

دولہا کا باپ گلے مل رہا تھا۔ لوگ ہاتھ ملا رہے تھے۔

''مبارک! مبارک!''

''چھوہارے! چھوہارے۔''

دولہا کے دوستوں کی چہلیں اور بھانڈوں کی جگتیں۔ یہ تمام مناظر نگاہوں کے سامنے سے یوں گزر رہے تھے جیسے فلم کا ٹریلر ہو!

لاؤڈ سپیکر حسب معمول موقع کی مناسبت کے برعکس فلمی گیت بجا رہے تھے۔

''بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ ہے نا!''

لاحول ولا! کیا بے تکا گیت ہے!

اور پھر یہ گانے بھی کھانے میں گم ہو گئے پلیٹوں' چمچوں' باتوں اور قہقہوں کے شور میں وہ خود ایک جزیرہ کی طرح تھا۔ اس کی بھوک ختم ہو چکی تھی اور اب وہ خالی پلیٹوں اور چمچوں کو بیٹھا گن رہا تھا۔ اندر دولہا عورتوں کا نشانہ بنا ہوا تھا لیکن اس نشانہ بننے کی اچھی قیمت وصول کر رہا تھا۔ خوب سلامیاں پڑ رہی تھیں' جہیز کا سامان ٹرک پر لادا گیا تو یہ دیکھ کر فخر سے اس کا سینہ تن گیا کہ ایک ٹرک میں پورا سامان نہ آ رہا تھا۔

بیٹی رخصت ہو رہی تھی' رو رو کر سب سے مل رہی تھی' وہ سہیلیاں جو سارا دن کھیں کھیں کرتی پھری تھیں اب ڈبڈبائی آنکھوں سے نجمہ سے لپٹی جا رہی تھیں۔ ماں' خالائیں چچیاں' سب رشتہ دار عورتیں گلے مل رہی تھیں رو رہی تھیں۔

''آؤ نجمہ سے مل لو۔''

اس کی بیوی آنسو پونچھتی گلوگیر آواز میں بولی' اس نے پاؤں اٹھانے چاہے مگر وہیں بت بنا کھڑا رہ گیا۔ ضبط سے چہرہ پر عجیب تناؤ تھا' اس نے مٹھیاں کھولیں اور بند کیں مگر قدم نہ اٹھ سکے' بیوی نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا تو وہ بے جان سا چلتا گیا۔

''راجہ بیٹا کس کا؟''

نجمہ بٹنے جیسی گول چمکیلی آنکھیں گھما کر دونوں کو دیکھتی۔

''امی کا کہ ابو کا؟''

''ابو کا!'' وہ زور سے بولتی اور بھاگ کر باپ کے پھیلے بازوؤں میں آ جاتی۔

''جاؤ ہم نہیں بولتے'' ماں روٹھ کر کہتی۔

''اچھا امی کا بھی؟'' نجمہ سمجھوتہ پر اتر آتی۔

''ہیں؟'' وہ مصنوعی غصہ سے بولتا۔

''نہیں نہیں ابو کا! ابو کا!'' نجمہ اس کے بازوؤں میں اچھل اچھل کر کہتی۔

''جاؤ ہم نہیں بولتے!'' ماں پھر روٹھنے کی اداکاری کرتی۔

''مت بولو!'' وہ کہتا۔

''ہاں مت بولو'' وہ بھی دہراتی۔

''میٹھی پپی ہے؟''

''نہیں'' وہ منہ پھلا کر کہتی۔

''کیوں''

''میری ٹافی کیوں نہیں لائے۔''

''دیکھو!'' وہ مٹھی میں ٹافی دکھاتا وہ چلاتی ''میٹھی پپی ہے' میٹھی پپی ہے۔''

''الف آم' ب بکری' پ پنکھا۔''

''ہائیں نجمہ تم تو سارا قاعدہ غلط پڑھ رہی ہو۔''

''وہ کیسے؟''

''سنو اصل قاعدہ یوں ہے۔ الف ابو۔

وہ زور سے ہنستی اور ب سے......''

''ب سے تمہاری امی۔''

''وہ کیسے؟''

''امی بکری ہی تو ہے۔''

''ہاہا!'' وہ کھل کھلا کر ہنس دی' تب پہلی بار احساس ہوا کہ ہنسنے میں اس کے گال میں گڑھا پڑتا ہے۔

''یہ دیکھو! ابو! میں نے کاپی پر آپ کا نام لکھا ہے۔''

''شاباش بیٹا''

''راجہ بیٹا کس کا''

ابو کا! ابو کا!...... نجمہ عبدالحق بعوض حق مہر دس ہزار سکہ رائج الوقت قبول ہے۔''

''قبول ہے؟''

''قبول ہے!''

''قبول ہے؟''

''قبول ہے!''

''ابو کا! ابو کا! قبول ہے! قبول ہے۔''

''الف سے ابو۔ ابو کا! قبول ہے۔ قبول ہے!''

خالی گھر پر عجیب سناٹا چھایا تھا' بیشتر مہمان چلے گئے تھے' چند رہ گئے وہ بھی سو رہے تھے۔ بیوی بھی سو رہی تھی آسودگی اور اطمینان کی نیند' کھانا بے حد اچھا تھا' جہیز کو سب نے پسند کیا تھا۔ بری کی چیزوں نے کئی رشتہ دار عورتوں کو آگ لگا دی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سسرال والے شریف لوگ معلوم ہوئے۔ لڑکا بھی بہت بھولا بھولا سا تھا جلد ہی اطمینان کی سانس آسودگی کے خراٹوں میں تبدیل ہو گئی۔ باپ کے سوا سب سو گئے تھے۔

بارہ ایک دو۔

اور پھر وقت کی ڈور بھی ہاتھ سے نکل گئی' اس نے زندگی میں پہلی بار رات کو دبے پاؤں چلتے محسوس کیا' تاریکی کی سرسراہٹ اور ہوا کی سرگوشیاں سنیں۔

رات کے پچھلے پہر بیوی کی آنکھ کھلی تو تاریکی میں سگریٹ کی سرخ آنکھ کو بیدار پایا ''تم جاگ رہے ہو؟''

''نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''کیوں؟ سارا دن کے تھکے ہوئے ہو نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟''

''بس نہیں آ رہی ہے!'' اس نے ایک طویل کش لیا تو سگریٹ کی چمک میں چہرہ ایک لمحہ کے لئے سرخ ہو گیا وہ جتنی دیر تک پھیپھڑوں میں دھواں رکھ سکتا تھا اتنی دیر تک رکھا اور پھر ایک طویل سانس میں دھواں باہر نکالا۔

''سونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔''

''میں میں سوچ رہا ہوں۔''

''سوچ رہے ہو؟ کیا؟''

''یہی! یہی کہ وہ حرام زادہ اس وقت میری پھول جیسی بیٹی کے ساتھ کیا کچھ نہ کر رہا ہوگا۔''

O....O....O

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

جن ہتھیلیوں پر سرسوں پھولتی ہے

''ہائے اللہ! یہ کتنی پیاری ہے۔''

میں اسے دیکھتا ہوں اور وہ میز پر رکھی ڈائری کو' دونوں کے گرد پوش جاذب نظر ہیں اور پشتے مضبوط۔

''ہاں! بہت پیاری۔''

وہ ہنس کر' مجھے نہیں بلکہ ڈائری کو دیکھتی ہے اور جب نہیں رہا جاتا تو اسے میز پر سے اٹھا لیتی ہے۔''ہائے اس میں تو تصویریں بھی ہیں...... "How sweet very sweet"

اس مرتبہ وہ مجھے ہنس کر دیکھتی ہے۔ میں ڈائری اس کے ہاتھ سے لے لیتا ہوں یوں کہ انگلیاں اس سے چھو جائیں' وہ خوش ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ شاید میں کچھ لکھ کر اسے پیش کروں گا مگر میں ڈائری دراز میں بند کر دیتا ہوں' اس کا منہ لٹک جاتا ہے۔

''آج شام فارغ ہو؟''

"Depends" وہ ناک سکیڑ کر کہتی ہے۔

''میں دفتر کے بدرنگ ماحول سے دور کسی اچھے سے ریستوران میں یہ خوش رنگ ڈائری آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔'' میرا لہجہ کسی وزیر کو سپاسنامہ پیش کرنے جیسا تھا۔ وہ کھل اٹھتی ہے۔

"How sweet of you"

''تو شام طے؟''

"Of course"

میرے ماموں ایک بہت بڑے بنک میں بہت بڑے افسر ہیں انہوں نے دو چار فون کیے، ایک دو لوگوں کے پاس وزیٹنگ کارڈ پر اپنے دستخط کر کے ملنے کے لئے بھجوایا اور لیجئے پیشتر اس کے کہ مجھے بیکاری کے مسئلہ کی شدت کا احساس ہوتا میں P.R.O بنا دیا گیا اور ملازمت کے سلسلہ میں مجھے پہلی مرتبہ کیلنڈروں، ڈائریوں اور ایسی ہی عام چیزوں کی اہمیت کا علم ہوا۔ دیوار پر محض لٹکنے اور سال بعد بیکار ہو جانے والا کیلنڈر اچھا خاصا کھل جا سم سم ہے تو ڈائری کثیر المقاصد چابی۔

جو شخص کراچی میں ایسی پبلک ریلیشنگ کرتا ہو اس کے لئے ملتان ایسے بے تکے شہر میں جانا سزا سے کم نہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں آ کر بہت بور ہوا۔ کہاں کراچی کے ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل اور کیلنڈروں سے کھیلنے والی لڑکیاں اور کہاں یہ شہر' آئے تین مہینے ہو گئے تھے اور میری دراز ڈائریوں اور کیلنڈروں سے بھری تھی میں انہیں دیکھتا اور کڑھتا۔

ایک اتوار سینما میں ظفر سے ملاقات ہوگئی وہ کراچی کے ایک اخبار کا نامہ نگار ہے۔ میں اسے کراچی سے جانتا ہوں اور میرا بے تکلف دوست ہے۔ اس کے ساتھ ایک شے بھی تھی۔ تھی سے مراد لڑکی نہیں بلکہ ایک بڑے میاں تھے۔ اپنے پیشہ کی وجہ سے مجھ میں خاصی مردم شناسی ہے اور جلد ہی دوسرے کو بھانپ لیتا ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ شکل سے تو وہ بڈھا کھسرا نظر آیا۔ خوب تیل چپڑ کر بالوں کی پٹیاں سر سے چپکا رکھی تھیں۔ چہرہ مدقوق سا اور رنگ بالکل زرد' پیشانی باہر کو نکلی' گال اندر کو دھنسے اور شیو بڑھی ہوئی...... یوں لگتا امرود کو چیونٹیاں چپکی ہیں۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا' تھیٹریکل انداز میں ہاتھ ملایا اور پھر اسے اپنے سینے پر بھی ملا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا تھا اور ہتھیلیاں پسینے سے تر' میرے تمام جسم میں کراہت کی لہر دوڑ گئی۔ جب ظفر نے اسے بنک اور میرے کام کا بتایا تو مارے خوشی کے اس نے پورے دانت باہر نکال دیئے...... محاورہ میں نہیں بلکہ حقیقت میں!

ایک ثانیہ میں اس کا حلیہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ دانتوں کا سیٹ گرا تو منہ سے پھک

کی سی آواز نکلی، دونوں کھلے ہونٹ بند ہو گئے اور گالوں کی جگہ دو گڑھے نمودار ہو گئے۔ اس ایک لمحہ میں اس کے چہرے نے ہنسی سے لے کر شرمندگی کی منزلیں جس تیزی سے طے کیں ان کا بیان الفاظ میں تو ممکن نہیں ہاں! سلو موشن فلم کی اور بات ہے۔ اس کا ہاتھ منہ کی طرف اٹھا اور آنکھیں بے بسی سے ہمیں دیکھ رہی تھیں کہ انٹرول ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

اگلے دن وہ کمرے میں بیٹھا شڑاپ شڑاپ چائے پی رہا تھا۔ چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے نہ اترتا کہ بولنا شروع کر دیتا سو منہ سے چائے کی رم جھم بھی ہو رہی تھی۔ دو کپ پینے کے بعد اس نے جیب سے میلا رومال نکالا اور بڑی شائستگی سے منہ پونچھ کر بولا۔

''مجھے ظفر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ افسانہ نگار ہیں۔''

''جی نہیں!'' میں نے کسر نفسی کی ''میں بھلا کیا افسانہ لکھوں گا۔''

اس پر وہ ہنسا مگر قدرے احتیاط سے۔ ''نہیں صاحب! آپ کیونکہ بڑے فنکار ہیں اس لئے یہ بات تکلفاً کہہ رہے ہیں۔ بھلا آپ کے افسانے کون نہ چھاپے گا اور پھر میں بھی تو شاعر ہوں۔''

اس نے ان دو غیر متعلق باتوں کو ایک ہی فقرے میں یوں ادا کیا کہ میرے منہ سے صرف یہی نکل سکا۔ ''کیا؟'' وہ ہنسا تو مصنوعی دانتوں کی چمک نے لشکارا مارا۔

''مجھے توقع تھی کہ آپ کو یقین نہ آئیگا۔''

''نہیں، نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''بات دراصل یہ ہے کہ میں ادھر ادھر کے بیکار پرچوں میں نہیں چھپتا۔''

''یہ تو آپ بہت ہی اچھا کرتے ہیں ویسے آپ چھپتے کن پرچوں میں ہیں۔''

''کسی میں بھی نہیں۔''

''کیوں؟''

''دیکھئے صاحب! مجھ ایسے شاعر کا کوئی وقار بھی تو ہونا چاہیے۔ مجھے بڑے بڑے ایڈیٹر خط لکھتے ہیں کہ خدا کے لئے تازہ کلام عنایت کیجئے۔ سالنامہ تیار ہے بس کاپیاں جڑ رہی ہیں بلکہ آپ کی غزل کے لئے ایک صفحہ خالی رکھا ہے۔ وقت پر غزل نہ ملی تو سالنامہ

بدمزہ ہو جائے گا۔ کوئی تصویر مانگتا ہے تو کوئی انٹرویو شائع کرنے کا خواہشمند...... مگر صاحب! میں گوشہ نشین شاعر ہوں۔ مجھے ایسی سستی شہرت اور گھٹیا پبلسٹی سے کیا لینا...... چھپنے کی خواہش تو وہ کرے جسے کچھ آتا جاتا نہ ہو اور مجھے تو شاعری خدا کی طرف سے ملی ہے...... وہ کیا کہتے ہیں التلمیذو...... ہاں' ہاں! میرا یہی مطلب تھا کہ شاعر خدا کے شاگرد ہوتے ہیں۔ آپ یہ سن کر یقیناً تعجب کریں گے کہ میں کسی کا شاگرد نہیں ہوں۔ بس اللہ کی دین ہے۔ آج تک کلام ناموزوں نہ کہا۔ آپ کو بچپن کا ایک واقعہ سناؤں۔ ہمارے اردو کے ماسٹر نے ہمیں ''میرا اسکول'' پر جواب مضمون لکھنے کو کہا تو صاحب! میں نے مضمون تو نہ لکھا البتہ ایک نظم کہہ ڈالی جب ماسٹر صاحب نے وہ نظم دیکھی تو مجھے گلے لگا لیا۔ بہت شاباش دی اور کہا جس طرح اقبال نے اپنے ماسٹر میر حسن کا نام زندہ جاوید کر دیا اسی طرح تم بھی ایک دن اپنے ماسٹر صاحب خدا بخش کا نام روشن کرنا! تو جناب! ہم کوئی تعلقات یا یاری دوستی پر چھپنے والے تو ہیں نہیں' ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ بڑے سے بڑا ایڈیٹر ہماری جوتی تلے ہے۔ یہ تو بس مشاعروں میں بعض اوقات بے عزتی ہو جاتی ہے صاحب ہر شاعر کا ایک مقام ہوتا ہے اس کے مطابق ہی اسے بلایا جاتا ہے۔ اب ہم ایسے اساتذہ کو اگر کل کے لونڈوں کے ساتھ پڑھوایا جائے تو سخت بے عزتی کی بات ہو گی' ہے نا؟''

''اچھا تو پھر آپ میرا اکاؤنٹ کب کھول رہے ہیں۔''

''جی؟''

''اجی! اس میں جی؟ کی کیا بات ہے۔'' وہ میرے لہجے میں ''جی؟'' کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''بس تو پھر منگوایئے فارم اور کھلوایئے میرا اکاؤنٹ۔''

''ضرور! ضرور۔''

''دیکھئے کرنٹ اکاؤنٹ کا فارم منگوایئے۔ بعض اوقات O.D لینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کیا پانچ سے کھل جائے گا؟''

''ہمارے بنک میں تو......''

''چلیں کوئی بات نہیں باقی آپ ڈال دیں یہ ادھار رہا اور ہاں! تو پھر کل آپ ہمارے ہاں چائے پر آ رہے ہیں نا؟''

جب میں اس کے گھر گیا تو دونوں بیٹیوں نے چائے کے ساتھ پیٹیز کا کام کیا۔ بڑی بہن بہت زیادہ دبلی اور بہت زیادہ سفید تھی اتنی کہ یوں لگتا مولی کے لپ اسٹک لگی ہے۔ اس کی آنکھیں کچھ گول گول سی لگیں تو میں ڈرا کر کہیں یہ پہلے جنم میں ناگن نہ ہو لیکن جب آنکھوں کی پتلیاں ہلتی دیکھیں تو اندازہ لگایا کہ یہ تو اس جنم کی ناگن ہے۔ تن پر پیڈ والی انگیا سجائے وہ یوں تن کر بیٹھی تھی جیسے باپ کے اشارے پر توپ چلا دے گی۔ یہ مسلسل باتیں کر رہی تھی۔ آواز باریک تھی مگر لہجہ تیز تھا! دوسری بہن خاموش بیٹھی گائے کی طرح منہ ہلاتی رہی۔ اس کے گلے کی V اتنی گہری تھی کہ اسے کچھ بولنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ کم بخت چھاتیاں ہی سب کچھ کہے جا رہی تھیں۔

دونوں بہنوں میں کسی طرح کی مشابہت نہ تھی۔ تب میں نے سوچا ایک باپ پر گئی ہے اور دوسری اپنی ماں پر' بہت سی باتوں کے بعد ان میں کچھ مشترک خصوصیات بھی دریافت ہو گئیں۔ مثلاً دونوں بی اے میں پڑھتی ہیں (کیسے؟) دونوں اپنے باپ کی بہت لاڈلی ہیں۔ (کیوں؟)۔ دونوں کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے (کتنا؟) اور دونوں نے میرے افسانے پڑھ رکھے تھے (کتنے؟)

''جب سے بچیوں کو یہ معلوم ہوا ہے کہ میں آپ سے مل چکا ہوں انہوں نے تو میرا کھانا پینا حرام کر دیا بس آپ کے نام کی رٹ لگا رکھی تھی۔''

''ہاں ڈیڈی! ہمیں ان سے ملنے کا بہت شوق تھا۔''

''ہاں پاپا! ہم تو ان کی بہت مداح ہیں۔''

میں یہ سب سن کر بہت خوش ہوا اور اسی خوشی کے جوش میں یہ پوچھ بیٹھا۔ ''آپ نے میرے افسانوں کا کون کون سا مجموعہ پڑھا ہے؟''

اس پر بڑی کو چائے سے اچھو لگ گیا اور چھوٹی کے حلق میں فش فنگر اٹک گئی اور خاصی دیر کے بعد جب دونوں ٹھیک ہوئیں تو ایک نے کیتلی اور دوسری نے دودھ دان اٹھایا اور اندر چلی گئیں۔

''بہت شرمیلی ہیں۔'' وہ انہیں جاتے دیکھ کر چہکے۔

''جی ہاں بہت شرمیلی۔''

''صاحب! یہ تو آپ کے نام کی کشش تھی جو یوں وہ بھاگی بھاگی چائے وغیرہ لا رہی ہیں ورنہ یہ تو کھڑکی سے باہر جھانکتی بھی نہیں۔ بس ہر وقت کتابیں پڑھتی رہتی ہیں۔ دنیا بھر کی کتابیں چاٹ ڈالی ہیں ان دونوں نے' سچی بات تو یہ ہے کہ میں غریب فنکار بھلا ان کی کتابوں کا خرچ کہاں سے برداشت کرتا وہ تو خدا نے نام اتنا اونچا کر دیا کہ آپ کی دعا سے ملک کا کوئی ایسا معیاری پرچہ نہیں جو مجھے اعزازی طور پر نہ بھیجا جاتا ہو پھر لاتعداد ایسے نادیدہ مداح بھی ہیں جو اپنی کتابیں اظہار عقیدت کے طور پر مجھے پیش کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سے ان دونوں کا شوق بھی پورا ہوتا رہتا ہے۔ کیا کہا لائبریری؟ شاندار جی ہاں!! میری بڑی شاندار لائبریری تھی۔ لیکن میں نے چند ماہ پہلے بچیوں کے کالج کی لائبریری کے لئے تمام کتابیں عطیہ دیدیں۔ نوبل؟ اجی صاحب! نوبل کیا' ہوا یوں کہ ان کے کالج میں ایک انعامی مشاعرہ ہوا جس میں مجھے چیف جج بنایا گیا۔ مشاعرہ کے بعد جب ان کی پرنسپل میری تشریف آوری کا شکریہ ادا کر رہی تھی تو باتوں باتوں میں کالج لائبریری کا ذکر آیا۔ اس پر وہ کہنے لگی محکمہ سے کتابوں کی گرانٹ نہیں مل رہی ہے آپ ملک کے اتنے بڑے شاعر ہیں اس لئے اس شہر کا آپ پر بھی حق ہے یہی نہیں بلکہ آپ کی بچیاں بھی یہاں پڑھتی ہیں اس لئے کالج کا بھی آپ پر حق ہے۔ آپ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر حکومت سے کچھ گرانٹ دلوا دیں۔ میں نے کہا جی میں تو ایک گمنام شاعر ہوں بھلا حکومت مجھے کیا جانے اس لئے گرانٹ والی بات تو ہونے سے رہی۔ البتہ اپنی بچیوں کے صدقے میں' میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ اپنی ذاتی لائبریری کالج کو دان کر دوں۔ بس صاحب! پرنسپل کا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ یقین مانیے خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہنے لگی میں کالج لائبریری آپ کے نام پر کر دوں گی لیکن میں نے منع کیا۔ پھر کہنے لگی اگر اپنا نہیں تو اپنی بیوی کا نام ہی سہی لیکن میں پھر بھی نہ مانا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ بھلا مجھے ایسی شہرت سے کیا لینا۔ بحیثیت شاعر ہی میری شہرت میرے لئے کافی ہے صاحب! یقین مانئے دو الماریاں کتابوں اور رسالوں سے بھر گئیں۔ اب تو اس گھر میں کوئی کتاب ہی نہ رہی بجز اس

کے.....'' انہوں نے بھائیں بھائیں کرتی الماری سے ابن صفی کا ایک گرد آلود ناول نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا اور اسی سانس میں بولے۔

''کل کی فلم طے؟''

''جی؟''

''بچیاں کل آپ کو فلم دکھا رہی ہیں۔''

فلم کیونکہ بچیاں دکھا رہی تھیں اس لئے اب لمبی سی ''جی؟'' کرنا حماقت ہوتی اور پھر اس نے مجھے اپنی غزلیں بھی تو نہ سنائی تھیں۔

اگلے دن وہ دونوں ہی آئیں۔

''ابا کہاں ہیں؟''

''پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''کیا ہوا؟''

''بس یونہی سر میں درد تھا۔''

''کوئی بات نہیں! تو ہم یہ پروگرام کینسل کر دیتے ہیں' پھر کبھی سہی۔''

''نہیں! نہیں!!! ایسا نہ کریں ڈیڈی سخت ناراض ہوں گے۔''

''پاپا کو تو آپ کا اتنا خیال تھا کہ انہوں نے آج باکس ریزرو کرا دیا۔''

''یہ تو ان کی زیادتی ہے یہ تو میرا فرض تھا اور پھر باکس کی کیا ضرورت تھی؟''

''بس پاپا کی مرضی۔''

پاپا کی مرضی کے سامنے ہم تینوں خاموش بے بسی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

''ڈیڈی کہتے تھے دونوں میں سے ایک واپس آ جائے۔''

''کیوں؟''

''پاپا کی طبیعت جو خراب ہے۔''

''ہاں! ہاں! پاپا کی طبیعت جو خراب ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے' دونوں میں سے ایک کو جانا ہی چاہیے۔'' میں دونوں کو خاموشی سے گھورتا رہا۔

''کون جائے گی؟''

دونوں کی نظریں جھکی تھیں۔اس میں شرمانے کی بات بھی نہ تھی۔اس لئے میرے خیال میں گال کھڑکی کے پردے کی وجہ سے سرخ ہورہے ہوں گے یا ہوسکتا ہے وہ سرے سے سرخ ہی نہ ہوں۔میں نے لمبا سانس لیا!''ٹھیک ہے!تو ہم ٹاس کر لیتے ہیں۔''

دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔اب کیونکہ فلم دیکھنا ہی تھی تو مجھے ان میں سے کسی کی آنکھوں میں جھانکنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔میں نے جیب سے ٹیڈی پیسہ نکال کر کہا۔''ہیڈ یا ٹیل؟ ٹیل والی جائے گی۔''

میں نے پیسہ اچھال دیا۔روشن دان سے آتی دھوپ میں وہ پیسہ چمکتا ہوا اوپر اچھلا جارہا تھا۔میں سحرزدہ سا اس ٹیڈی پیسہ کو دیکھ رہا تھا۔پیسہ کے فرش پر گرنے سے پہلے ہی میرے کانوں نے دونوں بیٹیوں کی آواز سنی''ٹیل''

O.....O.....O

مثلث کا ایک زاویہ

گوگال سے تھیٹر کی جلن ختم ہو چکی تھی مگر وہ اپنے دل کی جلن میں کمی نہ پا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھانے کے بعد چائے کے ساتھ ایک اور سگریٹ لگا کر گھسے ہوئے فلمی ریکارڈ اور اسے سننے والوں کی باتوں کے شور میں اپنے اعصاب کو کند ہو جانے کا موقع دینے کی کوشش کی۔

چائے تیز تھی اور اسے اس وقت تیز چائے اور تیز تمباکو والے سگریٹ ہی کی ضرورت تھی……

چائے کی پیالی سے دھوئیں کے باریک لکیریں سانپ کی زبان ایسی لہراتی خمیدگی لئے تھیں اور پھر ان لکیروں نے سگریٹ کے نیلگوں دھوئیں کے ساتھ مل کر ایک ناگن کا روپ دھار لیا۔ سیاہ رنگ، لشکارا مارتے دانت، پتلی کمر کے نیچے پھیلتے کولہے اور مکمل دائرے کی صورت میں ابھرتی گولایاں اور ان کے اشتراک سے ناگن والی بل کھاتی ٹور…… اس کے ذہن کو جھٹکا لگا اور سر کو جھٹک کر اس نے اپنی دانست میں گرد کی مانند اس کے تصور کو بھی جھٹک دیا۔

دھیان کی لہروں سے ذہن کی بے بس نیا کو بچانے کے لئے اس نے ہوٹل کی میزوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ اس کا محبوب نہ سہی مگر جانا پہچانا ہوٹل تھا اور نئے فلمی ریکارڈوں کے لئے وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کی منڈلی کے ساتھ یہیں آتا تھا۔ ہائے ہو اور شور کے اس سمندر ہی کو اپنے اعصابی تناؤ کے لئے ایک جزیرہ سمجھے بیٹھا تھا، عام حالات میں وہ

اسپیشل یعنی ملائی کی موٹی تہہ والی چائے پیتا مگر آج نہیں۔ آج تھپڑ کی جلن اور اس سے پیدا ہونے والی دل کی جلن کا علاج صرف تیز چائے اور تیز تمباکو والے سگریٹ ہی تھے اور شاید اسی لئے اب وہ تیسرا سگریٹ سلگائے خود کو احمق سمجھتے ہوئے تمام قصہ کا غیر جانبداری سے تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ یقیناً اس کی حماقت ہی تو تھی' اگر بچپن میں وہ بھی اس کے ساتھ گرمیوں کی دوپہروں میں کوٹھے کی ویرانی میں ''ابا امی'' والا کھیل کھیلتی رہی تھی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تمام عمر ہی اس کے ساتھ یہی کھیل کھیلتی رہے گی اور جب وہ یہ احساس کرتا کہ وہ اس کے بھائی کی منگیتر بھی ہے تو حماقت کے احساس پر ندامت غالب آ جاتی لیکن سوال یہ تھا کہ کیا شبیر بھی اپنی منگیتر سے محبت کرتا ہے' اس کا جواب انکار میں دے سکتا تھا۔ کیا وہ خود نجمہ کی محبت میں گرفتار ہے؟ لیکن بچپن کے کھیلوں کے باوجود بھی وہ اپنے دل میں اس کے لئے افسانوں اور فلموں والی محبت نہ پاتا تھا اور کیا نجمہ......؟ لیکن وہ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہ کہہ سکتا تھا ایک تو وہ عورت ذات تھی اور اس پر مستزاد اس کی سیاہ فامی۔ احمد کے خیال میں خوب صورت لڑکی کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہوتا وہ یا مغرور ہوگی اور یا بے وقوف...... اور ہر دو صورتوں ہی میں سمجھدار مرد اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر جو خوبصورت نہ ہو...... وہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہوتی ہے...... اور نجمہ بدصورت نہ سہی مگر جنسی کشش کے باوجود بھی اسے خوبصورت نہ کہا جا سکتا تھا۔ اسے پوجا نہ جا سکتا تھا لیکن استعمال ہو سکتی تھی۔

وہ چچازاد اور ساتھ کی کھیلی بہن تھی۔ شبیر نے اس میں صرف اس حد تک دلچسپی لی تھی کہ وقت بے وقت اس کی چٹیا کھینچ لی' گڑیا کا گھر توڑ دیا' املی چھین کر کھالی اور بس! اس لئے پٹ پٹانے کے بعد وہ احمد کی جانب رجوع کرنے پر مجبور ہوتی لیکن جوانی اور منگنی کے بعد سے وہ بات نہ رہی' گو وہ اب بھی اپنے آبائی مکان ہی میں تھے لیکن یوں محسوس ہوتا گویا ان کے آنگن میں ایک غیر مرئی دیوار کھینچ دی گئی ہو۔ منگنی کی وجہ سے شبیر اور نجمہ تو حقیقی جھجک اور مصنوعی شرم برتنے پر مجبور تھے ہی مگر یہ ہونے والا دیور مفت ہی میں مارا جا رہا تھا۔

سگریٹ ختم ہوا تو اس نے اسی سے نیا سگریٹ سلگایا' طویل کش سے دھوئیں نے پھیپھڑوں سے گزر کر اس کے اعصاب کو سکون فراہم کیا' ناک سے دھوئیں کی دو لکیریں

نکالنے کے بعد وہ پھر خیالات میں کھو گیا۔

ایک دن!

احمد نے شبیر کو ایک لڑکی کے ساتھ سینما سے نکلتے دیکھا اور اسے یقین تھا کہ وہ نجمہ کے علاوہ ہر لڑکی ہو سکتی ہے۔ برقعہ کے باوجود بھی وہ تیز نظر آتی تھی اور چلنے میں کندھوں اور کولہوں کے ہلنے میں جو خاص قسم کا آہنگ تھا اس سے اس کی چال میں عجیب سا لٹکا پیدا ہو گیا تھا۔ ہوں! تو بھائی صاحب رومانس لڑا رہے ہیں اس نے سوچا۔ اگلے دن جب موقع ملنے پر اس نے شبیر سے پوچھا تو پہلے تو اس نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن احمد کی اس یقین دہانی پر کہ وہ گھر میں بات نہ کرے گا اس نے اقرار کر لیا' ویسے بھی دونوں میں عمروں کا کم فرق تھا اس لئے کافی بے تکلفی تھی۔

''کیسی ہے وہ؟'' احمد کے اندر کا مرد یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''خاصی ہے۔ بری نہیں!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''چال تو خوب ہے۔''

''ہاں چال تو واقعی خوب ہے۔''

''کیا چالو مال ہے؟''

''کہہ نہیں سکتا۔''

''کیوں؟''

''میری اجمل کے ذریعہ سے واقف ہوئی تھی۔''

''تو اس نے پھانسی تھی کیا؟''

''شاید!''

''تو کیا تم اسے پیسے نہیں دیتے؟''

وہ ہنسا ''ابھی تک تو وہی مجھے پیسے کھلا رہی ہے۔''

احمد جلے بغیر نہ رہ سکا۔ ''شادی شدہ ہے؟''

''ہاں''

''اور خاوند......''

''منڈی میں آڑھتی ہے۔''

احمد لمبی چوڑی تفصیلات سے ہی چسکا لینا چاہتا تھا لیکن شبیر تو ایسے جواب دے رہا تھا گویا انٹرویو میں بیٹھا ہے لیکن وہ ایک سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکا ''نجمہ کا کیا بنے گا؟''

اس نے اس کی طرف چبھتی نظروں سے دیکھا ''نجمہ کا اس معاملہ سے کیا تعلق؟''

''کیوں اس کی شادی نہیں ہونی تم سے۔''

''تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے سبھی مرد شادی سے پہلے یہی کچھ کرتے ہیں'' اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم تو نہیں بتاؤ گے۔''

''نہیں تو' مجھے کیا پڑی ہے۔''

گو اس نے گھر بات نہ کی لیکن اب وہ شبیر سے خوامخواہ کا حسد محسوس کر رہا تھا۔ شبیر نہ تو زیادہ خوبصورت تھا اور نہ ہی اس کا احمد جیسا کسرتی جسم تھا پھر اسے ابھی تک ایسا موقع کیوں نہ ملا تھا وہ تو آڑھتی کی بیوی کو راکٹ بنا کر اڑا دیتا اور جب سے شبیر نے یہ بتایا تھا کہ اس نے ایک دو اور عورتوں سے بھی اس کے تعلقات کرا دیے ہیں تو وہ خود کو چارج شدہ بیٹری محسوس کرنے لگا تھا۔ اب شبیر نے اسے ان عورتوں کے ساتھ جنسی مہمات اور ان عورتوں کے سنائے ہوئے دیگر عورتوں کے لطیفے' جنسی واقعات اور گھریلو قصے بھی سنانے شروع کر دیے تھے اور یہ سب کچھ سن سن کر وہ بے قابو ہو جاتا۔ اب اس نے ورزش میں مزید اضافہ کر دیا مگر جسمانی تھکن بھی رات کو گہری نیند کا باعث نہ بن سکتی۔ جب اس نے محلّہ میں ایک دو لڑکیوں کو چھیڑ کر گالیاں بھی کھالیں تو اپنی قسمت پر شاکر ٹھنڈا ہو کر بیٹھ رہا۔

جس صبح شبیر نے اسے اجمل کے کیمرہ سے اتری آڑھتی کی بیوی کی ننگی تصویریں دکھائیں اس روز اس کا سارا جسم نٹ کے رسہ کی طرح تنا رہا۔ جب اس سے ''آٹو شاپ'' میں کام نہ ہو سکا تو چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا شاید امی اور چچی پڑوسن کے ہاں تھیں۔ سامنے غسل خانہ سے نہا کر نکلتی ہوئی نجمہ نظر آئی' گیلے بال تولیہ میں لپٹے ہوئے تھے اور قمیص بھیگ کر جسم سے چپکی جا رہی تھی۔

اسے سر پر کھڑے یوں گھورتے دیکھ کر وہ چونکی ''کیا بات ہے؟''

مگر وہ اسے مسلسل گھورے جا رہا تھا اس کی آنکھیں ایک ایک انگ کو گھول کر پیئے جا رہے تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے اختتام سے جو گرم رو چلی وہ اس کے تمام جسم کو گرم کرتی ہوئی کانوں کی لوں کو انگارے سے بنا گئی تھی۔ سانس تیز دھڑکن تیز......اور وہ اپنے جسم میں چھلانگ مارنے والے چیتے جیسا تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ نجمہ اس کے کانپتے نتھنوں اور نیچے لٹکتے ہونٹ سے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

وہ احمد کہہ کر چیخی......وہ جھپٹا!

ابھی احمد کی انگلیوں کے سرے سیلے ہی ہوئے تھے کہ اس نے تھپڑ سے اپنے گال پر پانچوں انگلیوں کے دہکتے نشانات ابھرتے محسوس کیے۔

نجمہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر حیرت اور شرم نے اسے بولنے نہ دیا۔ لب کپکپائے اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دوسرے ہی لمحہ وہ بھاگ کر کمرہ میں پہنچ چکی تھی۔

کھٹاک!

چٹخنی چڑھنے کی یہ آواز اس کے کانوں کو عجیب سی لگی۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح دھم سے چارپائی پر پر گرا' اس کا جسم کانپ رہا تھا...... جب کچھ دیر بعد صحن کی تیز دھوپ نے پسینہ سے اس کے جسم کو بھگو دیا تو اس نے کپکپی میں تو کچھ کمی محسوس کی مگر اعصابی تناؤ نے جسم کو یوں بوجھل بنا دیا تھا گویا وہ گوشت کا نہیں بلکہ سیسہ کا بنا ہوا ہے بڑی دیر تک وہ یوں ہی چارپائی پر لاوارث بستر کی طرح پڑا رہا۔

کافی دیر بعد اس نے اپنے جسم کو بمشکل گھسیٹا اور گھر سے نکل گیا اور بے مقصد آوارہ گردی کے بعد اب وہ شام کو خالی معدہ میں گرم چائے انڈیلے جا رہا تھا۔ اب جب کہ دماغ نے انسانوں کی طرح کام کرنا شروع کیا تو معاً اسے یہ خیال آیا کہ اگر نجمہ نے شکایت کر دی تو......؟ پھر اس نے سوچا کہ اسے نجمہ کو شبیر کی تمام دلچسپیوں سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا لیکن ساتھ ہی یہ سوجھی کہ نجمہ اس وقت اس کی کسی بھی ایسی بات کو تسلیم نہ کر سکتی تھی۔ ذہن میں خیالات الجھے دھاگوں کی مانند تھے مگر ایک سوال تو جیسے دماغ میں کنکھجورا بن گیا تھا...... آخر اس نے یہ حرکت کی ہی کیوں؟ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ اس کا ایک بے تکلف

دوست وہاں آ نکلا اور اس نے جو بیتی تھی کہہ سنائی اور پھر بولا۔

''اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

اس نے اپنے دوست کی طرف یوں دیکھا گویا پہلی مرتبہ اس سوال کو سن رہا ہو۔'' میں......میں......کچھ نہیں کہہ سکتا؟''

''کیوں'' دوست بولا'' ایسی ہی الجھن ہے کیا؟''

''یہی سمجھ لو۔''

''تم نجمہ سے محبت تو نہیں کرتے؟''

وہ ایک لمحہ خاموش رہا' پھر نتھنوں سے نکلتے سگریٹ کے دھوئیں کی مانند اس کی منہ سے نکلا'' نہیں۔''

''تو پھر......؟''

''تو پھر کیا......؟'' وہ چڑ کر بولا'' اللہ کے بندے۔ اگر یہ سب کچھ میری سمجھ میں آ جاتا تو تم سے بات ہی کیوں کرتا۔'' اس کا دوست خاموش رہا پھر وہ خود ہی بولا'' ایک بات تو ہے کہ اب میں شبیر سے ہی جلنے لگا ہوں'' اور اپنے دوست کی طرف یوں دیکھا گویا اس نے بہت ہی بری بات کی ہے۔ اس نے سر جھکا لیا تھا گو اس کی انگلیاں ایش ٹرے سے کھیل رہی تھیں مگر صاف ظاہر تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور ہی ہے' پھر ہونٹوں میں ٹکتے سگریٹ کو نکال کر چائے کے کپ میں ڈال دیا اور جب اس نے نیا سگریٹ سلگایا تو ہاتھوں میں معمولی سی لرزش تھی۔ ایک دو لمبے لمبے کش لینے کے بعد وہ اچانک اور قدرے بلند آواز میں بولا'' مجھے شبیر سے نفرت ہے۔'' اس نے دوست کی طرف دیکھنے کی بجائے نظریں ایش ٹرے پر گاڑ رکھی تھیں۔

''کہے جاؤ۔'' اس کا دوست نرمی سے بولا۔

''وہ باہر بھی عیش کرتا ہے اور اسے گھر میں بیوی بھی وفادار ملے گی۔ وہ ہمیشہ سے ہی فائدہ میں رہا ہے اور محض اس لئے کہ وہ اتفاق سے مجھ سے دو ڈھائی سال پہلے پیدا ہو گیا اور ہماری ماں تو اب تک اس پر واری صدقہ جاتی ہے۔'' اس کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں اور

آنکھوں میں نفرت کی عجب سی چمک، وہ سگریٹ کے جلتے ہوئے سرے کو گھورتا رہا پھر بولا۔
''مجھے کبھی بھی کسی قابل نہ سمجھا گیا اب منگنی ہی کو لے لو اس کی منگنی تو فوراً ہی ہوگئی اور میرے لئے ابھی تک لڑکیاں ہی دیکھی جارہی ہیں۔'' وہ خاموش ہوگیا، سگریٹ کو منہ میں رکھا مگر پھر کش لئے بغیر بے دھیانی میں اسے پھینک دیا گو ماتھے پر اب بھی سلوٹیں تھیں مگر آنکھوں سے نفرت والی چمک غائب ہوتی جارہی تھی ہونٹوں کے کونوں سے مسکراہٹ نمودار ہوئی جو شرارت آمیز ہنسی میں تبدیل ہوگئی ''میں نے بھی اسے بچپن میں بہت تنگ کیا ہے، میں اس کے کھلونے توڑ دیا کرتا تھا اور بعض اوقات تو رات کو اٹھ کر اس کے بستر پر پیشاب بھی کر دیتا تھا۔''

اب اس کے ماتھے سے شکنیں دور ہو چکی تھیں اور آنکھوں میں نفرت کی چمک بھی نہ رہی تھی، تناؤ کا خاتمہ ہو جانے سے وہ اب خود کو کھل کر سانس لیتا محسوس کر رہا تھا۔ مسکراہٹ اب ہونٹوں پر رینگ نہیں رہی تھی بلکہ تمام چہرے کو نئی رونق دے رہی تھی۔ اس نے اب پہلی مرتبہ گردوپیش پر دلچسپی سے نگاہ ڈالی اور پھر ہنس کر بولا۔

''ارے بھئی! اور چائے پیو گے؟''

O.....O.....O

بیلنس شیٹ

1۔ایک شریف سید خاندان سے تعلق رکھتی ہے (ویسے بعض لوگوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ انہوں نے اس کے باپ کو تقسیم ملک کے بعد سیّد بنتے دیکھا اس لئے وہ اس کے سیّد ہونے کی قسم بھی کھا سکتے ہیں لیکن یہ بکواس ہے اور صرف دشمنی کی وجہ سے کہا جاتا ہے)	1۔ خاندان تو کجا مجھے تو باپ کی حقیقت پر بھی شبہ ہے۔
2۔ایم اے (ریاضی)	2۔ ایم اے؟ بی اے؟ ایف اے؟؟؟ میٹرک؟؟؟
3۔ کالج میں لیکچرار تھی (شادی کے بعد ملازمت ترک کردی)	3۔ ملازم تو یہ بھی ہے مگر اس ملازمت کے لئے کسی ڈگری کی ضرورت نہیں۔ شاید یہ بھی شادی کے بعد چھوڑ دے۔ فی الحال تو شادی کا ہی امکان نہیں۔
4۔اکلوتی بیٹی	4۔ پون درجن بھائی بہن (چھ بہنیں جوان)

5۔ باپ کے انتقال پر ملال پر تمام جائیداد کی واحد وارث۔	5۔ باپ نے مرنے پر مختلف قسم کے قرضے چھوڑے۔
6۔ چڑچڑی۔ بد مزاج	6۔خوش اخلاق' شائستہ اطوار
7۔ ہفتہ میں کم از کم ایک لڑائی	7۔کبھی نہیں۔
8۔بالعموم بیمار رہتی ہے (بیشتر بیماریاں محدب شیشہ میں سے دیکھی جاتی ہیں۔ کھانسی کا مطلب ٹی بی' سینہ کی جلن کا مطلب چھاتی کا کینسر' پیٹ ابھرنے کا مطلب رسولی۔ افسوس ان میں سے کبھی کچھ بھی نہ ہو سکا)	8۔ ہمیشہ تندرست پائی گئی۔
9۔جلد ہانپ جاتی ہے	9۔ بار برداری کے جانوروں کی طرح مضبوط
10۔ وزن۔ 235 پونڈ	10۔ وزن۔ منفی 200 پونڈ
11۔50۔ 52۔48	11۔38۔20۔36
12۔ست (گویا رگوں میں سیسہ بھرا ہے)	12۔پھرتیلی (گویا رگوں میں بجلی دوڑتی ہے)
13۔سخت فضول خرچ (میری تنخواہ پر)	13۔سخت فضول خرچ (میری تنخواہ پر)
14۔چٹوری (حلوہ پوری' پراٹھے' مٹھائی وغیرہ وغیرہ۔)	14۔غالباً ہوا پر زندہ ہے۔
15۔ حس مزاح سے عاری (اکثر لطیفے سر سے گزر جاتے ہیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو تشریحی عبارت کے باوجود کارٹون نہیں سمجھ سکتے)۔	15۔ حس مزاح اہم ترین خصوصیت۔
16۔ بدہضمی اور کھٹے ڈکاروں کے باعث منہ سے بو آتی ہے (لپ اسٹک کے باوجود بدمزہ اور بعض اوقات تو تکلیف دہ ہو جاتی ہے)	16۔سانسوں میں جنسی اشتہا!

17۔ میک اپ کی ضرورت سے زیادہ شوقین'	17۔میک اپ کی ضرورت کے تحت شوقین
18۔جامہ زیب نہیں (کپڑا مہنگا مگر رنگ نامناسب)	18۔بیحد جامہ زیب (حتیٰ کہ بعد جامہ بھی زیب ہی زیب)
19۔شاپنگ کی شوقین۔	19۔شاپنگ کی شوقین۔
20۔سینما کی شوقین (پسندیدہ فلم: پنجابی)	20۔ سینما کی شوقین (پسندیدہ فلم :انگریزی)
21۔پسندیدہ ہیرو۔عنایت حسین بھٹی	21۔پسندیدہ ہیرو۔؟۔؟
22۔ٹانک کھاتی رہتی ہے (باعث: جسم)	22۔خود ہی ٹانک ہے (باعث: جسم)
23۔زیورات سے لدی پھندی۔	23۔بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں انگوٹھی تک بھی نہیں۔
24۔عورتوں کے لکھے ناولوں کی شوقین	24۔ مردوں کی لکھی جاسوسی کہانیوں کی شوقین۔
25۔صرف بڑی بڑی بیگمات کے سوشل فنکشنز میں جانا پسند کرتی ہے۔	25۔جہاں کوئی لے جائے جانے کو تیار۔
26۔ میری فرم کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں (بلکہ اس موضوع پر بات تک بھی نہیں سن سکتی)۔	26۔معقول مشورہ نہ دے سکے تو کم از کم دلچسپی سے بات سن سکتی ہے۔
27۔پھوہڑ	27۔......؟؟؟
28۔گھر کی سجاوٹ میں حسن سلیقہ کا فقدان	28۔کبھی اصلی گھر نہیں لے گئی اس لئے کہا نہیں جا سکتا۔
29۔کرخت آواز' چیختا لہجہ	29۔ شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔
30۔چائے ناپسند	30۔نفیس چائے پسند کرتی ہے۔

31۔ خوبصورت نہیں	31۔ بدصورت نہیں۔
32۔ جنسی کشش سے عاری (بلکہ دیکھتے ہی جنسی خواہش ہوا ہو جائے)	32۔ جنسی بلی ہے۔
33۔ جنس بیزار (وظیفۂ زوجیت تک کی ادائیگی سے متنفر)	33۔ جنس پسند (ہر نوع کے تجربات کے لئے ریڈی میڈ۔)
34۔ اسکینڈلوں سے دلچسپی	34۔ اسکینڈلوں سے دلچسپی۔
35۔ سہیلیوں کے معاملہ میں کم ظرف	35۔ سہیلیوں پر جان چھڑکنے والی۔
36۔ بچوں کی تربیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔	36۔ ہنوز مس ہے۔
37۔ شریف۔	37۔ بدمعاش۔
38۔ بیوی (اے کاش!)	38۔ داشتہ (اے کاش)

احمد نواز اپنی اس بیلنس شیٹ تیار کرنے میں انتہائی منہمک تھا کہ کئی آوازوں بعد چونکا۔

''ارے آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے دو کالموں میں منقسم کاغذ کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔

''تو بولتے کیوں نہیں۔''

''بول تو رہا ہوں اور کیسے بولوں۔''

''میں اتنی دیر سے چیخ رہی ہوں۔''

''وہ تو تمہاری عادت ہے'' وہ آہستہ سے بولا۔ وہ کمرہ میں داخل ہو چکی تھی۔

''کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔''

''سینما نہیں چلنا۔''

''سینما؟ کون سا سینما؟''

''یاد نہیں رہا کیا؟''

''ہاں یاد ہے۔ یاد کیوں نہیں۔''

''بھلا کون سی فلم پہ جانا تھا؟'' وہ جیسے زبانی امتحان لے رہی ہو۔

''کون سی فلم پہ جانا تھا؟'' وہ نالائق طالب علم کی طرح ذہن پر زور ڈال رہا تھا اور وہ غصیلی استانی کی طرح اسے گھور رہی تھی۔ بس اس منظر کی تکمیل کے لئے اس کے ہاتھ میں ایک رول تھما دینے کی کسر تھی اور پھر اسے یاد آ گیا۔ خوشی کا نعرہ لگا کر بولا۔

''یاد آ گیا نام!''

''کیا تھا بھلا۔''

''نوکر ووہٹی دا۔''

''شاباش!''

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام